جلد ۹۴ ستمبر ۱۹۸۰ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمۂ قرآن مجید

مع مختصر حواشی

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

اس میں

مترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادہ مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن کے خلاصے سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

دُوسرا ایڈیشن ◉ ہدیہ =/۹۰ روپے

اِدارہ ترجمان القرآن ○ اچھرہ ○ لاہور

فون نمبر : ۴۱۰۳۱۶

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	ستمبر ۱۹۸۰ء مطابق شوال ۱۴۰۰ھ	جلد ۹۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ــــ ۴۱۱۰۱۶ ــــ ۴۰۳۱۶

زر سالانہ بیس روپے - فی پرچہ -/۲ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے اپنے فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اشارات کا ایک خصوصی سلسلہ اپریل سے شروع کیا تھا۔ بھاسنوں کے کالعدم ہونے کے بعد میں نے اپنے ضمیر کی تحریک سے تمام خادمانِ دین کو اس غرض کے لیے مخاطب کیا کہ وہ اقامتِ دین کے نصب العین پر نگاہیں مرتکز کر کے امکانی حد تک جو کچھ کر سکتے ہیں، کریں۔ نیز وہ اپنے آپ کو جمود سے بھی بچائیں اور آہستہ کار ذہنی انحرافات سے بھی۔ میں اپنے دورِ فرصت کو بانجھ نہیں رہنے دینا چاہتا جب کہ ہر لمحہ گھڑیال کی منادی یہ ہوتی ہے کہ گردوں نے عمر کی ایک اور گھڑی گھٹا دی ہے۔ یہ سلسلہ ابھی جاری رہنا ہے اور میں ستمبر کے لیے اپنا مضمون لکھ چکا تھا مگر مسلمانوں کے تازہ مصائب کی لہروں نے میری توجہ مسئلہ قدس اور بھارتی مسلمانوں کی انتہائی مظلومی کی طرف منعطف کرا دی۔ اس دفعہ کے اشارات میرے احساسات ملت کے جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ بعد میں سابق سلسلہ اشارات بحال کر دیا جائے گا۔ (ن۔ ص)

(۱)

پہلا مسئلہ یروشلم کا ہے۔

یروشلم جو صیہونی ریاست کے بعد بھی مسلمانوں کے کنٹرول میں چلا آ رہا تھا، پچھلی جنگ میں یہودیوں نے اس پر قبضہ کیا۔ مسلمانوں کا عمل دخل ختم کیا "مشرقی حصہ" جس میں مسلمانوں کی عظیم مقدس تاریخی مسجد اور گنبد صخرا واقع ہے، اس میں بے محابا تصرف ہی نہیں کیا، اس کی توہین بھی کی۔ اب کیمپ ڈیوڈ کے سمجھوتے کے مطابق ہونے والی بیگن سادات گفتگو کے عین دوران میں اسرائیلیوں نے تازہ اقدام یہ کیا کہ یروشلم سے متنازعہ

شہر کو دارالحکومت بنا لیا۔ اور اس کے لیے پارلیمنٹ سے بل پاس کرا لیا۔ کجا یہ کہ غرب دریائے اردن کے عرب علاقے میں یہودیوں کی بستیاں بسانے کے خلاف مسلمانانِ عالم سراپا احتجاج بنے ہوئے تھے، اوپر سے مادہ پرستانہ جمہوریت کے پیرائے میں لاجمہوریت کا نیا کرتب دکھا دیا گیا۔

اب مسلم اقوام اور حکومتیں اضطراب دکھا رہی ہیں اور ان کے اثر سے اقوام متحدہ نے بھی یروشلم کو صیہونی دارالحکومت بنانے کے خلاف قرارداد پاس کر دی ہے مگر ایسی کئی سابق قراردادیں اسرائیلی دھاندلیوں کے پیروں تلے پامال ہو رہی ہیں۔

یہ کونسا ڈھکا چھپا راز ہے کہ دونوں سپر پاورز کی سرپرستی صیہونی ریاست کو اس لیے حاصل ہے کہ مسلم دنیا کے ایک سرے پر یہ مسلم دشمن قوتوں کی ایک مضبوط چوکی ہے۔ بلکہ اسلحہ کے ذخیروں سے بھری ہوئی قلعہ بندی۔ اس سے مقصود تیل کے چشموں اور تجارتی منڈیوں کا تحفظ ہی نہیں بلکہ ملحدانہ تہذیب کو آگے بڑھانا اور مسلمانوں کو جارحیتوں، شرارتوں اور سازشوں سے اذیتیں دے دے کر کمزور کرنا بھی مطلوب ہے تاکہ مسلمان اول تو کبھی سر نہ اٹھا سکیں اور کچھ ترقی وہ کریں بھی تو اس شرط پر کہ احیائے اسلام کا کام نہ ہونے پائے۔

صدر امریکہ نے کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کی پٹڑی بچھا کر "مصر اسرائیل دوستی" کی جو گاڑی چلائی تھی، وہ ابھی بیچ راستے ہی میں تھی کہ وائٹ ہاؤس کے گرد صدارتی انتخاب کا طوفان امڈنے لگا۔ صدر کارٹر مجبور ہو گئے کہ کامیابی کے لیے یہودی ووٹ حاصل کریں۔ اس مقصد کے لیے انہیں صیہونیوں کی حرکتوں سے چشم پوشی کے ساتھ خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ بلکہ بعید نہیں کہ پورا پورا سودا اندر اندر ہی چک گیا ہو۔

سوال یہ ہے کہ اب کیا ہو؟ مسلم عوام میں سخت اضطراب ہے، حکومتیں احتجاجی بیانات دے رہی ہیں، ادارے اور تنظیمیں غم و غصہ سے بھری ہوئی قراردادیں پاس کر رہی ہیں، خطیب آتشیں تقاریر کر رہے ہیں، مدیران مؤثر اداریے لکھ رہے ہیں اور یہ ابتدائی ردعمل تو ہونا ہی چاہیے۔ ایک مؤثر فیصلہ یہ ہوا ہے کہ جن ممالک کی حکومتیں تل ابیب سے اپنے سفارت خانے یروشلم منتقل کریں (یا واپس نہ لے جائیں)، ان کے خلاف تیل اور تجارت اور دوسرے دوستانہ تعلقات ختم کر دیے جائیں۔ اقوام متحدہ کی قرارداد میں بھی اس فیصلے کی تائید کی گئی ہے۔ بیشتر حکومتوں

نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا ہے۔ نئی آواز سعودی عرب کی ہے۔ یہاں سے شہزادہ فہد نے جہاد کا نعرہ بلند کیا ہے۔ یقیناً حقیقی حل یہی ہے اور ایک نہ ایک دن اس کو جامۂ عمل پہننا ہے۔ مگر جہاد کی دوسری جو کچھ بھی ضروریات ہوں، اولیں اہمیت اتحاد کی ہے جو اسلامی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیئے۔ اتحاد کا قیام بھی بجائے خود جہاد ہی کا ایک اقدام ہے۔

خدا کا احسان ہے کہ چند سال سے مسلم اقوام نے اتحاد کی سمت میں خاصی پیشقدمی کی ہے۔ مگر ابھی کچھ چٹانیں اور دراڑیں اس راہ میں رکاوٹ ہیں انہیں جلد دور ہونا چاہیئے۔

مسلم اقوام کی متعدد نزاعات ہیں، کیونکہ کچھ روس کے زیر اثر ہیں اور کچھ امریکہ کے سایۂ عاطفت میں۔ یہی صورتِ حالات حقیقی اسلامی اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وقت کے جو نو بہ نو چیلنج پندرھویں صدی کا افتتاح کرتے ہوئے ابھر رہے ہیں۔ ان کا توڑ کرنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ دونوں سامراجی قوتوں کا دست آموز ہونے سے انکار کر دیا جائے اور آزادانہ مؤقف سے اپنے معاملات کو — خواہ وہ زرعی و مدنی ہوں یا تجارتی و مالیاتی، یا دفاعی — اسلامی بصیرت کے ساتھ خود حل کیا جائے۔ جس سے بھی معاملہ کیا جائے اپنی آزادانہ اور خود دارانہ پالیسی کے تحت کیا جائے۔ جس دن یہ تبدیلی آگئی، سمجھیئے کہ مصیبت کے دن کٹ گئے۔

خاص طور پر یہاں مصر کی روش کا ذکر اس لئے کیا جا رہا ہے کہ ہمارا یہ برادر مسلم ملک خاصی بڑی تاریخ اور وقیع حیثیت رکھتا ہے اور اسرائیلی ریاست کے معاملے میں اس کا پارٹ اہم اور مؤثر رہا ہے۔ مگر کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کا امریکی جادو ایسا چلا کہ صدر سادات نے نہ تو عالمِ اسلام کے مجموعی رجحانات کی پرواہ کی اور نہ اپنے ہمسایہ عرب ممالک کی۔ اس طرح اختلاف کا ایک بڑا رخنہ مسلم محاذ میں پڑ گیا۔ بعض لوگوں نے پھر بھی حسنِ ظن قائم رکھا کہ شاید مصر کوئی داؤ دے کر بڑی حد تک بازی جیت لے جائے گا۔ لیکن عالمِ اسلام سے انقطاع نے اُدھر اتنی کمزوری پیدا کر دی ہے کہ امریکہ اور یہود اس سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دریائے اردن کے مغربی علاقے میں یہودی بستیاں بسانے کا سوال تو پہلے ہی موجود تھا اور اب مسئلہ قدس یاس انگیز سطح تک جا پہنچا ہے۔ کیا یہ مناسب نہ تھا کہ صدر سادات ان اقدامات کا سخت نوٹس لیتے اور صاف کہہ دیتے کہ ان اقدام کو واپس لینے کے بعد ہی صیہونی امید کر سکتے ہیں کہ ان سے گفت و

یہ مہم جاری رکھی جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ عالمِ اسلام اور عرب ممالک سے مصر کی جو دوری پیدا ہو گئی ہے، اس کا ازالہ ہو جاتا اور گفت و شنید کا التوا بھی مشروط نوعیت کا ہوتا۔

بہر حال آج وقت مسلمانانِ عالم کے سامنے جو تقاضے اور مصائب لے کے کھڑا ہے وہ بصیرت و تدبّر کا تقاضا کرتے ہیں۔ بصیرت و تدبر پہلے ضروری ہے، اتحاد اور جہاد تو بعد ہی میں ہو سکتے ہیں۔

مسئلہ فلسطین کو بڑا نقصان اس وجہ سے پہنچا کہ ابتداءً کئی سال تک اسے عربوں کا علاقائی مسئلہ بنا کر رکھا گیا۔ حالانکہ یہ اسلامی مسئلہ تھا اور اس سے سارے عالمِ اسلام کا تعلق تھا۔ برصغیر کے مسلمان تو تشکیل پاکستان سے بھی پہلے اعلان بالفور کے سخت مخالف رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی مسئلہ فلسطین کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ بعد میں اہل پاکستان اور حکومتِ پاکستان نے بھی عرب نیشنلزم کی پروا نہ کرتے ہوئے اس مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھا۔ اب خدا خدا کر کے چند برس سے مسئلہ فلسطین کو صحیح اسلامی رنگ میں دیکھنے کا آغاز ہوا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ ہے کہ اس مسئلے پر مسلمانوں کا اتحاد بھی پہلے سے زیادہ ہے اور اب جہاد کا اسلامی رجحان بھی سامنے آ رہا ہے مگر ابھی مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

---

(۲)

دوسرا دردناک مسئلہ بھارت کے مسلمانوں کا ہے۔

کالی دیوی ایک بار پھر مسلمانوں کے جلتے مکانوں کے سامنے ان کی نعشوں پر رقص ناز کر رہی ہے اور بھارت کے برہمنی، مہاجنی سامراج کی قیادت ان کے خون سے اپنے پائے نخوت کو حنا آلود کر رہی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف حالیہ ہنگامۂ بربادی اگرچہ ۱۹۴۷ء کے مسلم کش بلووں کے بعد سب سے بڑا طوفان ہے مگر نہ صرف یہ کہ ہرحال مسلمانوں کے خلاف کئی کئی سو بار تباہی کے اقدامات ہوتے رہے ہیں۔ بلکہ بھارت کی مسلم دشمنی اور مسلم کشی کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ ایک واقعہ اگر استثنائی طور پر رونما ہوتا تو اس کی آسانی سے کوئی خوبصورت توجیہہ کی جاسکتی۔ اس کی ذمہ داری کسی شرپسند

سنسر سکے سرڈالی جاسکتی ۔ یہ نکتہ بھی اچھالا جاسکتا کہ یہ بیرونی طاقت کی سازش ہے ۔ مگر گذشتہ ۳۳ سال میں تین چار ہزار بار تو ایک ہی طرح کی سازش نہیں کی جاسکتی تھی کہ کبھی ایک علاقے میں اور کبھی دوسرے علاقے میں بھارت کی سب سے بڑی اقلیت کو ایک ہی جیسے طریق واردات سے نشانہ بنایا جائے، یعنی مسلمانوں کے مخالف فرقہ پرست مفسدوں اور پولیس اور فوج کی مشترکہ کارروائی سے مسلمانوں کی خونریزی ہو، جانی نقصان ہو، بچے تک مارے جائیں ۔ خواتین کی آبروریزی کی جائے ۔ اور خاص اہتمام سے گھروں کے ساتھ ساتھ دکانوں اور کارخانوں کو جلایا جائے تاکہ اُن پر مستقل معاشی تباہی بھی وارد ہو ۔ یہ تو ملک کے اندر ہی مسلم دشمن قوتوں کی ایک طویل سازش ہے جو اپنے گُل کھلا رہی ہے ۔

آیئے ذرا ۳۳ سال کی مسلم کُشی کے مذہبی اور تاریخی پس منظر پر ایک نگاہ ڈال لیں ۔

بھارت کی اکثریتی قوم جو حکومت چلا رہی ہے، یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ یہ دنیا اور اس کی زندگی ایک بے مقصد رام لیلا ہے ۔ دیوی دیوتاؤں کا رچایا ہوا کھیل ہے جو آپس میں لڑتے بھی ہیں اور ایک دوسرے کو دھوکا بھی دیتے ہیں ۔ پھر یہ قوم چونکہ سانپوں، گایوں، بندروں، درختوں، دریاؤں اور پہاڑوں کو پوجتی ہے اس لیے احترامِ انسانیت کے جوہر سے عاری ہے ۔ کسی پکے ہندو کے سامنے اگر ایک طرف کوئی گائے ڈوب رہی ہو اور دوسری طرف کوئی غیر ہندو انسان، تو وہ گائے کو بچانے کو ترجیح دے گا ۔ ہندو قوم اپنی مذہبی ساخت کے اعتبار سے حقوقِ انسانی کا کوئی تصور نہیں رکھتی ۔

ایک طرف اِس قوم نے اپنے دائرے کے اندر انسانوں کو مختلف صنفوں میں تقسیم کرکے اعلیٰ ترین حقوق برہمنوں کو دیئے ہیں اور شودروں اور اچھوتوں کو جانوروں سے بھی بدتر مقام پر رکھا ہے، دوسری طرف یہ قوم ٹھیک یہودیوں کی طرح اپنے دائرے سے باہر کے انسانوں کو ملیچھ (ناپاک) سمجھتی ہے اور اُن سے مذہبی بنیادوں پر شدید نفرت رکھتی ہے ۔ چنانچہ برصغیر کی پچھلی ہزار سالہ تاریخ اِن کی مسلم آزاری کی ظالمانہ اور گھناؤنی تاریخ ہے ۔

مسلمان حکمران تھے تو اُن کے حُسنِ سلوک کے باوجود اُن کے خلاف سازشیں اور بغاوتیں جاری رکھیں ۔ اطاعت و وفا کے معاہدے کرتے اور پھر غداری دکھلاتے ۔ اکبری دَور میں ان کا دربار اور حرم سرا میں عمل دخل اتنا بڑھا کہ انہوں نے اکبر کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا اور محل میں صنم پرستی، آفتاب پرستی

خنزیر پروری، ماتھے پر ہندوؤں کی طرح قشقہ کھینچنے کی روایت، اسلام کے ساتھ استہزاء، مسلمان علماء کے قتل جیسے فتنوں نے زور پکڑا۔ اس طلسم باطل کو توڑنے کے لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔ اور ان کی دعوت اورنگ زیب کے دور میں پورے برگ و بار لائی۔ جب کہ سلطنت کا کام دینی بنیادوں پر چلایا جانے لگا۔ اور اسلامی قوانین کا اجراء ہوا۔ اسی وجہ سے ہندو اورنگ زیب سے سخت بیزاری رکھتے ہیں اور اس کی تصویر مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف بغاوت انگیزی کے جذبے سے بنکم چندر چٹر جی نے بڑا زوردار ناول لکھا جس میں بندے ماترم کا زہریلا ترانہ شامل ہے۔

پھر جب انگریزی اقتدار قائم ہوا تو مسلمانوں کی حکمرانی کا انتقام لینے کے لیے یہ قوم انگریزوں کی چھیتی بن بیٹھی اور تعلیم، تجارت اور ملازمتوں پر قبضہ جمایا۔ مسلمان جو نئی کافرانہ حکومت کے خلاف تحریک مجاہدین اور ۱۸۵۷ء کے انقلابی معرکے میں خاک و خون میں تڑپ گئے اور مقدمہ ہائے بغاوت میں شدید ترین سزاؤں کا نشانہ بنے، ان کو بعد کے سارے دور میں ایک ایک دفتر اور ایک ایک بازار میں ہندو تعصب کے وار سہنے پڑے۔ پھر جب مسلمانوں کی مجاہدانہ تحریکیں ناکام ہو گئیں تو ہندوؤں نے کانگریس کے جھنڈے تلے تحریک آزادی کا آغاز۔ مسلمانوں کو ساتھ لے کر ان سے قربانیاں لیں اور ان قربانیوں سے "سیکولر (وطن پرستانہ) ہندو اسٹیٹ" قائم کرنے کے منصوبے بنائے تاکہ مسلمانوں کو پوری طرح اکثریت کے شکنجے میں کس دیں اور اسلام کا نام تک نہ لینے دیں۔ یہ منصوبہ اس لیے مخفی نہ رہ سکا کہ جب بھی مسلمانوں کے حقوق کا سوال اٹھا تو ہندو تعصب حائل ہو گیا۔ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں چلا کر جب مسلمانوں کو دعوت ارتداد دی جانے لگی تو آنکھیں کچھ کھلیں اور بعد میں پنڈت جواہر لال نہرو نے "مسلم ماس کانٹیکٹ" کے ذریعے مسلمانوں میں سوشلزم اور لادین وطن پرستی کو پھیلانے کی مہم شروع کی تو اندھوں کو بھی دکھائی دینے لگا کہ مسلمانوں کے دینی و تہذیبی وجود کو ختم کرنے کی یہ نئی چال ہے۔ آخر میں تعلیم کے دائرے میں جب کانگریس نے وردھا اسکیم (ودیا مندر اسکیم) کو اختیار کیا تو بلی تھیلے سے بالکل ہی باہر آ چکی تھی بلکہ بلی کیا تھی، پورا "بگھیاڑ" تھا۔ (پنجابی لفظ معنی بھیڑیا یا عام فہم)

ان حالات میں چند سال کے اندر اندر مسلمانوں میں اپنے ملی و تہذیبی وجود کو بچانے کے لیے جداگانہ مسلم مملکت کے حصول کا جذبہ بڑھتا چلا گیا، اور ۱۹۴۰ء میں انہوں نے باقاعدہ ریزولیوشن کر کے ملک کی تقسیم اور مسلم انڈیا کی الگ حکومت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہی فیصلہ تحریک پاکستان کا پہلا واضح

اظہار تھا۔

تحریک پاکستان کے خلاف ہندوؤں نے پروپیگنڈے اور چالوں کا سارا زور صرف کر دیا۔ قائداعظم اور تصورِ پاکستان کا ہمیشہ توہین آمیز طریق سے مذاق اڑایا گیا۔ مگر یہ تحریک کامیاب ہو گئی۔ اب بھارت کے برہمنوں اور مہاجنوں نے نئی اسکیم یہ بنائی کہ پاکستان نامی علیحدہ مسلم مملکت اس طرح بنے کہ وہ چل نہ سکے۔ پہلا اقدام یہ کیا گیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ذریعے ریڈ کلف (نئی سرحد کا فیصلہ کرنے والے کمیشن کا سربراہ) سے سازش کر کے عین آخری وقت پر مسلمانوں کے نہایت اہم اکثریتی علاقے بھارت کی جھولی میں ڈال دیئے گئے۔ خصوصاً گورداسپور کا علاقہ بھارت کو دینے کے صاف معنی یہ تھے کہ ریاست جموں و کشمیر کی مسلم اکثریت آزاد مسلم مملکت میں شامل نہ ہو سکے گی۔ باشندگانِ ریاست کی مرضی کے بغیر خفیہ طریق سے غیر مسلم مہاراجہ نے بھارت سے ریاست کے الحاق کی دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ پھر مار مار کر کے بھارتی فوجیں وہاں داخل کی گئیں خود بھارت نے کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کے سامنے پیش کیا اور وہاں سے باشندگانِ ریاست کے استصواب کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلے پہ آج تک بھارت نے عمل نہیں کیا۔

کشمیر کی طرح ریاست جوناگڑھ اور مناوڈر کو بھی بھارت نے ہڑپ کر لیا بعد میں حیدرآباد کی ریاست کو بھی فوج کشی کر کے زیرنگیں کیا گیا۔

پھر یہ سازش بھی ریکارڈ پہ تحریری طور پر موجود ہے کہ ایک تو بھارت کی خواہش یہ تھی کہ اُن کا چہیتا گورنر جنرل پاکستان کا بھی پہلا گورنر جنرل ہو تاکہ وہ ایسے تصرفات کرے جن کا فائدہ فوراً یا بعد میں بھارت کو ملے۔

دوسری تجویز یہ تھی کہ دس پندرہ سال کے لیے پاکستان اور بھارت کو مشترک دفاع کے نظام میں کس دیا جائے تاکہ دفاع کے حیلے مالیات اور تعلیم اور دستور و قانون ہر چیز کو متاثر کیا جا سکے، بلکہ کسی نازک مرحلے پر خط تقسیم کو محو کر کے پاکستان پر قبضہ جما لیا جائے۔ قائداعظم کی بصیرت، اور مسلم عوام کی ہنود بیزاری نے اس سازش کو دونوں پہلوؤں سے ناکام کر دیا۔

مسلم دشمنی اور پاکستان دشمنی کا ایک مظاہرہ یہ بھی تھا کہ اثاثوں کی جو غیر منصفانہ تقسیم کی گئی تھی، اس کے تحت بھی پاکستان کو جو حصہ ملنا چاہیے تھا اسے روک لیا گیا۔ بلکہ فنڈز کی (باقی برصفحہ ۳۹)

اسلامی حکومت کیوں؟

از امام سید روح اللہ خمینی
ترجمہ: محمد نصر اللہ خان خازن

دُنیا میں قانون ہی انسانی معاشرے کی اصلاح اور اُس کی خوش حال زندگی کی ضمانت دیتا ہے لیکن معاشرے کی اصلاح اور خوش حالی کے لیے محض قوانین کا مجموعہ کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لیے قانون کا عملی نفاذ ضروری ہے۔ اور قانون کے نفاذ کے لیے کسی با اختیار ادارہ ——— قوت حاکمہ ——— کا وجود ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے دُنیا میں بعثتِ انبیاء کے ذریعہ ایک طرف مجموعہ قوانین کا انتظام کیا۔ اور دوسری طرف حکومت کا قیام ضروری قرار دے[1] کر قوانین کے اجراء و نفاذ کے لیے ضروری ڈھانچہ مہیا کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی معاشرے میں سربراہ مملکت کی حیثیت سے تمام انتظامی ادارات

---

[1] مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ (المائدہ: ۴۹) (اور یہ کہ تم اُن کے درمیان حکومت کرو اس ہدایت کے مطابق جو اللہ نے اُتاری ہے۔ اور اُن کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ہوشیار رہو کہ وہ تمہیں فتنہ میں مبتلا کر کے اس ہدایت کے کسی جزو سے نہ پھیر دیں جو اللہ نے تمہاری طرف نازل کی ہے)۔

[2] نیز ارشاد ہے: وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدہ: ۴۴) اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اُتارا ہے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔ - مترجم

خود چلاتے رہے ہیں۔ خصوصاً آپ نے دعوت و تبلیغ، فصلِ خصومات اور نظمِ مملکت جیسے اہم ترین امور کے لیے ضروری احکام و قوانین کے نفاذ کا اہتمام کیا۔ یہاں تک کہ باقاعدہ حکومت معرضِ وجود میں آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں محض نو بعداری قوانین وضع کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اُن کے نفاذ کی عملی کوشش کی گئی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چور کا ہاتھ کاٹا ہے، مختلف جرائم پر کوڑے لگائے، کچھ جرائم پر رجم کی سزا دی ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ کے غیر معمولی فرائض آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم ترین فرائض سے کسی طرح کم نہ تھے۔ کیونکہ خلیفہ کا تقرر محض تبیینِ احکام کے لیے نہ تھا، بلکہ خلیفہ کے فرائض میں تنفیذ و اجرائے احکام بھی شامل تھا۔ یہی وہ مقصد ہے جس سے خلافت کی اہمیت و عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد خلیفہ کا تعین نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ العیاذ باللہ آپؐ نے رسالت کا فریضہ ہی ادا نہیں کیا۔ ظاہر ہے، جو مسلمان نئے نئے اسلام میں داخل ہو رہے تھے انہیں اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ کوئی با اختیار شخصیت ان پر خدا کا قانون نافذ کرے اور اس کے احکام اور اس کی شریعت لوگوں پر جاری کرے تاکہ انہیں دنیا و آخرت کی سعادت نصیب ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی قوانین نافذ کرنے اور اجتماعی ادارات چلانے کے لیے ایک با اختیار شخص یا ادارہ کی ضرورت قطعی ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی محض قانون سازی سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، نہ اس سے معاشرے کو کوئی خوشحالی نصیب ہو سکتی ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ قانون ساز ادارہ کی پشت پر انتظامی قوتِ نافذہ کا وجود نہایت ضروری ہے۔ صرف اسی طریقے سے عوام عادلانہ قانون سازی کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اسلام نے قانون سازی کے پہلو بہ پہلو با اختیار انتظامیہ کا وجود ضروری قرار دیا ہے اور معاشرہ کی تعلیم و تربیت اور ذرائع ابلاغ کے علاوہ تنفیذِ احکام کے لیے ولی الامر

---

[1] "خلیفہ" کی اصطلاح کا استعمال امام خمینی کی تقریروں اور تحریروں میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اُن کی ذہنی وسعت کا نشان ہے۔ (ایڈیٹر)

یا صاحب اختیار) کا تقرر بھی کیا ہے[1] - ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور سیرتِ طیبہ سے تشکیل حکومت

[1] آیت کریمہ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ الخ (النساء ۵۹) (اے ایمان لانے والو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں) ہیں "ولی الامر" صاحب امر کی اطاعت ہم پر فرض کی گئی ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد "اولوالامر" "ائمہ اطہار" ہیں جنہیں اس بات کا مکلف کیا گیا ہے کہ وہ اسلامی قوانین و احکام کی تشریح کریں۔ مسلمانوں اور دوسرے اہل عالم میں انہیں پھیلا دیں۔ اسی طرح انہیں اس بات کا مکلف بھی کیا گیا ہے کہ وہ ان احکام و قوانین کو دنیا میں نافذ کریں اور ائمہ اطہار کے بعد عادل و منصف فقہاء پر یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں (مصنف)

(نوٹ) مندرجہ بالا آیت سے استدلال کرتے ہوئے اصل کتاب کے حاشیہ نگار نے "اولوالامر" سے صرف "ائمہ اطہار" مراد لے کر تخصیص کر دی ہے - حالانکہ آیت کے الفاظ اس کی تائید نہیں کرتے - آیت مذکورۃ الصدر میں لفظ "مِنْكُمْ" (تم میں سے) کے ذریعہ "اولی الامر" کی صراحت کر دی گئی ہے - مِنْكُمْ میں موجود ضمیر جمع مخاطب یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان لانے والو) کی طرف راجع ہے جنہیں اس آیت میں خطاب کیا جا رہا ہے اور وہ اہلِ ایمان بھی ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں - اس طرح آیت کا اطلاق تمام اہل ایمان پر ہوتا ہے - یعنی اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ ان اولوالامر کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہوں۔ ان میں ائمہ اطہار کے علاوہ باقی اہل ایمان بھی شامل ہیں - ہمارے نزدیک اسلام میں ان تمام "اصحاب امر" کی اطاعت واجب ہے جو خود بھی خدا اور رسول خدا کے اطاعت گزار ہوں - کیونکہ اسلام میں خدا و رسول کی نافرمانی کرنے والوں کی اطاعت جائز نہیں - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا طاعة فی معصیة الخالق (خالق کی نافرمانی کی صورت میں کوئی اطاعت نہیں ہے) اولوالامر کی مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو "اسلامی ریاست" (مصنفہ مولانا مودودی) صفحہ ۱۸۵ تا ۱۹۱ و صفحہ ۳۸۲ تا ۳۸۶ - (مترجم)

علاوہ ازیں پیچھے جو خلیفہ کی بحث امام خمینی نے کی ہے اسے پڑھ کر بتایئے کہ آیا رسول اللہ کے بعد کوئی نظام حکومت نہیں تھا، کوئی انتظامیہ نہیں تھی، اور شریعت نافذ نہیں تھی؟ اگر ایسا ہوتا تو اہلِ حق قلت کے باوجود اسی طرح اٹھ کھڑے ہوتے جس طرح امام حسینؓ کھڑے ہوئے تھے - امام حسینؓ کے والد اور جمیع اہل بیت موقع (باقی بر صفحہ آئندہ)

کی اہمیت و ضرورت کے بارے میں واضح رہنمائی ملتی ہے۔ اولاً آپ نے اپنے عہد مبارک میں حکومت کی باقاعدہ تشکیل کی ہے، تاریخ اس پر گواہ ہے۔ آپؐ ریاست کے باقاعدہ سربراہ تھے۔ آپؐ نے مختلف علاقوں پر گورنر مقرر کیے۔ خود ایک جج کی حیثیت سے لوگوں کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کیا اور ملک کے دوسرے حصوں میں باصلاحیت اشخاص کو مقدمات کے تصفیہ کے لیے قاضی کے منصب پر مامور فرمایا۔ اپنی ریاست کے باہر مختلف قبائل کے سرداروں اور مختلف ملوک وسلاطین کی طرف سفیر بھیجے۔ مختلف رؤسا وسلاطین کے ساتھ صلح وجنگ کے معاہدات کیے۔ جنگوں کی بذاتِ خود قیادت کی۔ اور مختصر یہ کہ اسلام کے جملہ احکام بالفعل ملک میں نافذ کیے۔ ثانیاً اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپؐ نے اپنے بعد خلیفہ کا تقرر فرمایا[1]۔ تاکہ

(بقیہ نوٹ از صفحہ سابقہ)

پر موجود تھے۔ غلط بحثوں سے ایسے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے (ایڈیٹر)

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] اللہ تعالیٰ کا یہ حکم قرآن کے اس ارشاد سے مستفاد ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ الخ (النور ۵۵) (اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ اُن کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے.....) حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی قدس سرہ العزیز اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "اس جگہ ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے یہ وعدہ بعد کے مسلمانوں کو تو بالواسطہ پہنچتا ہے بلاواسطہ اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود تھے۔ وعدہ جب کیا گیا تھا اس وقت واقعی مسلمانوں پر حالت خوف طاری تھی اور دینِ اسلام نے ابھی تک حجاز کی زمین میں بھی مضبوط جڑ نہیں پکڑی تھی۔ اس کے چند سال بعد یہ حالت خوف نہ صرف امن سے بدل گئی بلکہ اسلام عرب سے نکل کر ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصے پر چھا گیا۔ اور اس کی جڑیں اپنی پیدائش کی زمین ہی میں نہیں کرۂ زمین میں جم گئیں۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پورا کر دیا۔ اس کے بعد کوئی انصاف پسند آدمی مشکل ہی سے اس امر میں شک کر سکتا ہے کہ تینوں حضرات کی خلافت پر خود قرآن (باقی بر صفحہ آئندہ)

وہ ان ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتے جن کا بوجھ آپ نے خود اٹھا رکھا تھا۔ آپ کا خلیفہ مقرر کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ کے بعد نظم حکومت کو باقی اور جاری رکھنا اہلِ ایمان کے فرائض میں داخل ہے۔ چونکہ خلیفہ کا یہ تقرر اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا اس لیے حکومت[1] اس کے امارات اور اس کے انتظامی ڈھانچے کو قائم اور جاری رکھنا بھی خدا ہی کے حکم سے تھا۔[1]

یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ تنفیذِ احکام کی ضرورت عہدِ نبوی تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ یہ ضرورت ہمیشہ کے لیے ہے کیونکہ اسلام کسی خاص زمانے یا کسی خاص علاقے کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ جاری و ساری نظامِ زندگی ہے، اس لیے اس کے احکام و قوانین کا نفاذ اور انسان کی اجتماعی زندگی پر ان کا اطلاق اور پابندی بھی ہمیشہ کے لیے ہے۔ جب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلال قرار دیا ہوا قیامت تک کے لیے حلال اور آپ کا حرام کیا ہوا بھی قیامت تک کے لیے حرام ہے تو آپ کی قائم کردہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کی مہرِ تصدیق لگی ہوئی ہے اور ان کے مومن صالح ہونے کی شہادت اللہ تعالیٰ خود دے رہا ہے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو نہج البلاغۃ میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی وہ تقریر پڑھ لے جو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایرانیوں کے مقابلے پر خود جانے کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کی تھی۔" (تفہیم القرآن جلد ۳ صفحہ ۴۱۹) اس کے بعد مولانا محترم نے پوری تقریر نقل فرمائی ہے۔ یہ تقریر نہج البلاغۃ خطبہ نمبر ۱۴۶ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں استخلاف فی الارض کے بارے میں تفصیلی بحث اسلامی ریاست ص ۱۳۵ تا ۱۴۴ اور ص ۹۵ تا ۲۰۳ میں ملاحظہ فرمائیں (مترجم)

اگر کوئی شخص انکار کرے کہ حضورؐ نے اپنے بعد حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ مقرر نہیں فرمایا تھا تو وہ یہ بھی وضاحت کرے تو پھر حضورؐ کی تعلیم و تربیت جماعت ایسی کمزور تھی کہ جسے خلیفہ مقرر فرمایا تھا اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص خلافت پر قابض ہو گیا اور پوری جماعت ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ مزید یہ بھی فرمائیے کہ دورِ صدیقی و فاروقی و عثمانی میں نظام اسلامی تھا یا غیر اسلامی؟ غیر اسلامی تھا تو رسول اللہ کے چہیتے اور پسندیدہ عنصر کا فریضہ کیا تھا؟ (ایڈیٹر)

[1] یہاں پچھلی بحث کا واضح جواب آگیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد" حکومت، اس کے امارات اور اس کے انتظامی ڈھانچے کو قائم اور جاری رکھنا خدا ہی کے حکم سے تھا۔ ورنہ جیسے کہ آیت اللہ امام خمینی یہ کہہ چکے ہیں کہ "اس کا مطلب یہ ہوگا کہ العیاذ باللہ آپؐ نے رسالت کا فریضہ ہی ادا نہیں کیا۔" (ایڈیٹر)

حدود کو معطل کرنا، آپ کی تعلیمات کو مہمل قرار دے کر اُن سے بے نیاز ہو جانا، آپ کے جاری کردہ احکامِ قصاص کو ترک کر دینا یا اُمتِ مسلمہ اور ممالکِ اسلامی کی اعتقادی اور جغرافیائی سرحدوں کے تحفظ و دفاع سے دستبردار ہو جانا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ یہ تصوّر کہ اسلام کسی خاص زمانے یا کسی مخصوص علاقے کے لیے آیا تھا، اسلام کے اساسی عقائد و نظریات کے سراسر خلاف ہے۔ چونکہ اسلام کے احکام و قوانین کا نفاذ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کے لیے ضروری ہے اس لیے ایسی حکومت کا قیام اسلامی نقطۂ نظر سے از حد ضروری ہے، جس میں نظمِ حکومت چلانے اور احکام نافذ کرنے کی صلاحیت و قوت موجود ہو۔ اگر ایسی حکومت قائم نہ کی جائے یا وہ نفاذِ احکام کے لیے ضروری طاقت و قوت سے محروم ہو تو معاشرے میں اجتماعی بگاڑ اور اعتقادی و اخلاقی بے راہ روی پیدا ہو گی۔ اس لیے معاشرے کو اس سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسی حکومت کے قیام کے سوا چارہ نہیں ہے، جو معاشرے کی پوری اجتماعی زندگی کو عدل و انصاف پر قائم کر کے انسان کو انسان کی غلامی سے آزادی اور معاشی و معاشرتی پریشانیوں سے امن و سکون بخش سکے۔

یہ بات شرعی مقتضیٰ اور عقلی دلیل سے ثابت ہو گئی ہے کہ حکومت کے سلسلے میں جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ضروری تھا وہی کچھ بعد کے ادوار میں حتیٰ کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے دور میں بھی ضروری تھا۔ اور وہی کچھ آج ہمارے اِس دور میں بھی ضروری ہے۔ اب اس کی مزید وضاحت کے لیے میں آپ کی توجہ اس سوال کی طرف مبذول کراتا ہوں کہ ہمارے امام مہدیؑ کی غیبتِ کبریٰ پر ایک ہزار سال سے زیادہ مدت گزر گئی ہے۔ پیشتر اس کے کہ زمانے کے حالات امام منتظر کے دوبارہ ظہور کے مقتضی ہوں کئی ہزار سال گزرنے کا امکان ہے۔ اب اس طویل مدت کے دوران میں کیا اسلام کے احکام معطل رہیں گے؟ اس عرصے میں لوگ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتے رہیں گے؟ کیا اس سے معاشرے کی اجتماعی زندگی میں گڑبڑ نہ پیدا ہو گی؟ وہ قوانین جن کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کو دعوت دی اور جن کی نشر و اشاعت، تبلیغ و تشریح اور تنفیذ و اجراء میں تیئیس سال صرف کیے کیا وہ ایک محدود مدت کے لیے تھے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے شریعت کی عمر صرف دو سو سال ہی مقرر فرمائی تھی؟ کیا اسلام کو غیبتِ صغریٰ کے بعد ہر چیز سے دست بردار ہونا تھا؟[۱] میرے نزدیک یہ رائے اس عقیدہ سے

---

[۱] یہی وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت حضرت مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے (باقی بر صفحہ آئندہ)

جس کہیں بڑھ کر ناقابل قبول ہے کہ "اسلام منسوخ ہو چکا ہے!" جو شخص اللہ اور آخرت پہ ایمان رکھتا ہو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ "وطن کی سرحدوں کا دفاع ضروری نہیں ہے۔ یا یہ کہ خمس یا زکوٰۃ کی ادائیگی سے روکنا جائز ہو سکتا ہے یا یہ کہ اسلام کا تعزیری قانون معطل اور بیکار ہو چکا ہے۔ یا یہ کہ آج کے دور میں قصاص اور دیت لینا بڑا سنگین فعل ہے" وغیرہ۔ لہٰذا جو شخص یہ رائے رکھتا ہے کہ اب اسلامی حکومت کے قیام کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ وہ گویا اسلامی احکام کے نفاذ پہ یقین نہیں رکھتا۔ وہ دراصل اسلامی احکام کے تعطل اور جمود کا داعی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ سرے سے اس بات ہی کا انکار کرتا ہے کہ اسلام ایک جامع اور ہمہ گیر نظام زندگی ہے۔

کسی مسلمان کو بھی اس بارے میں شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی حکومت کا وجود ضروری ہے۔ اس معاملے میں سب متفق ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو صرف اس معاملے میں ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے؟ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ حکومت (علیٰ منہاج النبوت) آنحضورؐ کے بعد بھی اپنے جملہ انتظامی ادارات، تنفیذی اختیارات اور امتیازی خصوصیات کے ساتھ بالعموم موجود تھی حتیٰ کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے زمانے میں بالخصوص وہ اسی صورت میں موجود تھی[۱] یاد رہے کہ اسلامی قوانین خود اس بات کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

آج سے ۳۲ سال پیشتر یعنی ۱۹۵۲ء میں کراچی بار ایسوسی ایشن کے سامنے "اسلامی دستور کی تدوین" کے موضوع پر اپنی تقریر کے ان الفاظ میں کی تھی۔ "اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں سے حضرات شیعہ اس بات کے قائل ہیں کہ نبی کی طرح امامت کا منصب بھی توقیفی ہے یعنی امام بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مامور ہوتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف بھی عملاً یوں ختم ہو گیا ہے کہ شیعہ حضرات کے نزدیک بھی بارھویں امام کی غیبت کے بعد چونکہ منصب امامت ان کے ظہور ثانی تک موقوف ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کی سربراہ کاری اب بہرحال کسی غیر مامور من اللہ ہی کے سپرد ہونی چاہیے"۔

(مترجم)		(اسلامی ریاست ص ۳۴۷)

حاشیہ صفحہ ہذا:

[۱] اس موقع پر بھی اور اس سے قبل بھی امام خمینی نے پہلے تین خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، و حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافت کا ذکر محض اشارہ کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

بتین دلیل ہیں کہ یہ ایک ایسی ریاست کا قیام عمل میں لانے کے لیے وضع گئے ہیں جس میں تمام شہریوں سے منصفانہ سلوک کرنے والی قوتِ نافذہ، عادلانہ اقتصادی نظام اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حامل ایک تہذیب وجود میں آئے۔

آپ غور فرمائیں شریعت کے احکام ایسے مختلف النوع قوانین پر مشتمل ہیں جن سے ایک ایسا اجتماعی نظام معرضِ وجود میں آتا ہے جو افراد معاشرہ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون و خیر خواہی اور ایک دوسرے پر اعتماد و انحصار کی فضا پیدا کرتا ہے۔ یہ ایسا عادلانہ نظام ہے جو انسان کی تمام بنیادی ضروریات مہیا کرتا ہے، معاشرے کے تمام افراد کے مابین بہتر معاشرتی تعلقات استوار کرتا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ۔

شبہ سامنے مخاصمرز بیان ہے۔ لیکن آپ کی تحریر سے یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تینوں خلیفہ میں، خلافت کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے لے کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت تک تحریک حکومت کے اس تسلسل کے قائل ہیں جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم کیا تھا۔ اس کا اشارہ امام خمینی خود آغاز بحث میں کر چکے ہیں۔ ہم اس انداز فکر کو اس پس منظر میں دیکھیں کہ آپ کی یہ تحریر دراصل آپ کے وہ لیکچرز ہیں جو آپ نے ایران میں کامیاب اسلامی انقلاب آنے سے تقریباً دس سال پیشتر ۱۳ ذیقعدہ سے یکم ذوالحجہ ۱۳۸۹ھ تک نجف اشرف میں علوم دینی سے فراغت پانے والے شیعہ علماء دین کی ایک بڑی جماعت کو دیے تھے۔ ان لیکچرز میں آپ نے علماء کے اذہان میں اسلامی حکومت کے قیام کے سلسلے میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کے ازالہ کی کوشش کی ہے۔ اور انہیں فریضہ اقامتِ دین کے لیے کمربستہ ہونے کی دعوت دی ہے۔

بحث و نظر

بخدمتِ گرامی ـــــــ!

(نعیم صدیقی)

(جادۂ اقامتِ دین کے ہمقدم دیرینہ مولانا وصی مظہر ندوی کے ایک خط کا جواب، جس کا متن درج کرنا اس لیے ضروری نہیں ہے کہ اوّل تو ندوی صاحب کا طرزِ فکر پہلے سے معلوم ہے، دوسرے میرے جوابات کے پس منظر میں اُن کے گرامی نامے کے مندرجات کی جھلک صاف دکھائی دے سکتی ہے)

محترمی و مکرمی جناب وصی مظہر صاحب! السلام علیکم

آپ کی توجہ فرمائی کے لیے شکریہ! کہ آپ یارانِ کہن کو بھولے نہیں۔ پھر آپ کی اس تحسین کے لیے بھی امتنان جو راقم ناچیز کے لیے پُر زور طریق سے آپ نے فرمائی ہے۔ مگر افسوس ہوا کہ اس ساری تحسین کی آخری نوک آپ کا یہ اظہار رہے کہ دیکھا تم بھی انہی باتوں کے قائل ہو گئے نا، جن کے لیے ہم قافلے سے کٹ کر بہت دُور آ گئے ہیں۔[1]

آپ کے گرامی نامے کا جواب دینا جس جماعت کا کام تھا وہ تو موجود نہیں ہے، میں تو ایک فرد ہوں جس کو اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے متفرق احباب دکھائی دے جاتے ہیں۔ آپ نے اصل میں جو باتیں کہی ہیں، ان کا مرکزی خیال ایسا ہے کہ بحالاتِ موجودہ زیادہ تفصیل و وضاحت سے بحث کرنا مشکل ہے۔ میں

---

[1] یہاں میں اس بات کی تردید کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے میرے پیش رَو بزرگوں نے کبھی پیچھے ہٹایا ہو۔ میں از خود آہستہ آہستہ اپنے دائرہ عمل کو اس لیے محدود کرتا رہا ہوں کہ میری صحت زیادہ بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہی خصوصاً اعصابی نظام لمحاتِ کشمکش میں اپنا پورا حق ادا نہیں کر سکتا۔

آپ کے سوالات کو ایک طرف رکھ کر آپ کے مرکزی خیال کو توجہ کا ہدف بناتا ہوں اور اس سلسلے میں بس کچھ متفرق نکات عرض کروں گا۔ اور امید رکھوں گا کہ آپ سنجیدگی سے ان پر غور کریں گے۔

۱- آپ نے اگر مجھ پر اپنے نظریات کی تبلیغ کرنا چاہی ہے تو یہ اس لیے بیکار ہے کہ میں کسی جذباتی ریلے میں بہتا ہوا نہیں آرہا، بلکہ پچھلے چالیس برس میں میں نے ضروری چیزیں مسلسل پڑھی بھی ہیں۔ اپنوں اور غیروں سے بحث و اختلاف کا سلسلہ بھی رہا ہے، نت نئے حالات و واقعات کو ایمانی شعور سے زیر غور لا کر ان میں دین کا راستہ تلاش کرنے کی کاوشیں بھی کی ہیں۔ مخالفین کے مخالفانہ حملوں کو بھی بھگتا ہے اور برسوں کے رابطے توڑ کر کنارہ کر جانے والے مختلف اصحاب کے طرز فکر اور ان کے رنگا رنگ کرداروں کا جائزہ بھی لیا ہے اور ان کی اس حرماں نصیبی کو بھی دیکھا ہے کہ ان میں سے بعض اتنا کام بھی نہ کر سکے جتنا وہ ہم گنہ گاروں کے ساتھ چلتے ہوئے کر رہے تھے، بعض وسیع درجے کے کام سے علیحدہ ہو کر کسی محدود قسم کے کام کو لے کے بیٹھ رہے، بعض نے سرے سے "اقامتِ دین" کا کام ہی چھوڑ کر "اقامتِ ذات" کو اپنا نصب العین بنایا۔ مجھ ایسے آدمی پر جو فکر و شعور رکھتا ہو اور بعض بظاہر معصوم کنارہ کشوں" کی اصل مجبوری سے واقف ہو، اب اس پر آپ تبلیغ کیا کریں گے۔ کہکشاں سے ٹوٹنے والے تاروں کا انجام اس نے دیکھ لیا ہے تو وہ اب کہکشاں سے اور زیادہ ہی چمٹے گا۔

آپ کی ساری تبلیغ کی جان اس طرزِ عمل نے نکال دی ہے کہ آپ ہم سے کنارہ کرنے والوں کو اپنی نگاہِ مقدس سے جس طرح بے عیب دیکھتے ہیں اور ان کی کمزوریاں بلکہ بعض یاوگیاں آپ کو ذرا نہیں کھٹکتیں نہ دوسرے مذہبی گروہوں کے ژولیدہ احوال پر آپ کو کوئی احساس ہوتا ہے، لے دے کے ہم گنہ گار ہی رہ گئے ہیں جنھیں بہت سے اصحاب نے پہلے درونِ خانہ رہ کر رگیدا[1]، اور اب بیرونِ خانہ سے بھی عنایات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

---

[1] میں خود ذاتی طور پر بعض اکابر کے مزکیانہ تجربوں کا تختۂ مشق بنا ہوں، اور اب کیا بتاؤں کہ کس درجے کے حضرات کو خاص خاص موقعوں پر شائستگی کے ادنیٰ معیارات سے بھی گرا ہوا پایا۔ مگر سب کچھ ایک مقصدِ اعلیٰ کے لیے صبر سے بھگتا اور یہی خیال کیا کہ شاید یہ سب سعیِ اقامتِ دین کے تقاضے ہیں۔

۲ — تبلیغ کے بجائے صحیح صورت افہام وتفہیم کی ہوتی، مگر افہام وتفہیم تو زیادہ تر برابر کے لوگوں میں ہوتی ہے۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ اہلِ تقویٰ، سرگشتگانِ کوچۂ عشق کے لیے "مسیطر" بنے ہوتے ہیں۔ اتفاق یہ ہے کہ آپ کا گرامی نامہ مجھے عین اس وقت ملا جبکہ میں نے مولانا منظور نعمانی کی کتاب[1] ——— ایک ہی دن پہلے منگا کر پڑھنا شروع کی تھی۔ اور کچھ عرصہ پہلے علی میاں کی وہ تنقیدِ مخالفانہ بھی پڑھ چکا ہوں جو "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں" کے خلاف لکھی گئی ہے۔ مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہر طرف سے کچھ حضرات ہماری غلطیاں پکڑنے میں اس طرح لگے ہیں جیسے ماہی گیر مچھلیاں پکڑتے ہیں، مدعا یہ کہ یا تو غلطیوں کو مانو اور ہمارے سامنے سر خم کر دو، یا نہ مانو تو ہم اہلِ تقویٰ تمہارے خلاف لوگوں کے دلوں کو شکوک و شبہات سے بھر دیں گے۔ ایسی نابرابری میں، جبکہ ایک جانب "تعصبِ تقویٰ" کام کر رہا ہو، یا "تقویٰ پرستی" کا مظاہرہ ہو تو افہام وتفہیم کی فضا کہاں رہی۔

۳ — ترجمان القرآن میں اپریل تا جون کے اشارات میں جو باتیں میں نے لکھی ہیں، خوب سوچ سمجھ کر لکھی ہیں، اور اس ساری گفتگو کی نوعیت یہ ہے کہ اپنے جاننے والے احباب سے میرا تکلم برادرانہ ہے۔ گویا میں گھر میں بیٹھ کر اپنے خاندان سے باتیں کر رہا ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میری باتیں سرگوشی کے طور پر نہیں بلکہ ذرا بلند آہنگی (LOUD THINKING) سے کام لیا گیا ہے۔ اس واشگاف گوئی سے میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ خاندان کے باہر کے لوگ بھی جان لیں کہ یہ لوگ زندہ ہیں، جمود زدہ نہیں۔ وہ یگانگت کی ایک ایسی مشینری پر اعتماد رکھتے ہیں جو اپنی درستی خود کرنے والی (SELF REPAIRING) ہو۔ میں اور میرے دوست باہمدگر مشورے بھی کرتے ہیں۔ آپس میں تنقید بھی کرتے ہیں، احتساب بھی کرتے ہیں، غلطیوں پر بھی نظر ڈالتے ہیں، ان کا اعتراف بھی کرتے ہیں، پھر اصلاح بھی کرتے ہیں۔ ہمیں بسا اوقات آپس میں ایک دوسرے کو تلقین بھی کرنی ہوتی ہے۔ یہ کام بالعموم چپکے سے ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہ بھی ضروری ہے کہ کبھی کبھار یہ بلند آہنگی سے بھی ہوں، تاکہ بیرونی عناصر کو معلوم ہو جائے کہ یہ ایسے خادمانِ دین ہیں جو پیری مریدی کے طرز پر کام نہیں کرتے بلکہ ضمیر کے مطابق سوالات اور اعتراضات اٹھانے اور ان کے جواب طے کرتے ہوئے سرگرمِ عمل ہیں۔
یہ طریقہ فی الحقیقت قرآن ہی کا پیش کردہ ہے جس نے سخت نازک حالات اور طرح طرح کے مخالفین میں گھرے ہوئے مسلمانوں پر غزوہ بدر و احد اور دوسرے غزوات اور خاص خاص واقعات وحوادث

[1] عنوان ہے: "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت اور اس کی سرگزشت اور اب میرا موقف"۔

کے بعد بڑی سخت تنقیدیں کی ہیں، اور اس کی پروا نہیں کی گئی ہے کہ دشمن قومیں کیا کہیں گی اور کیا فائدہ اُٹھائیں گی۔ بلکہ قرآن نے تو غالباً خود مخالفین پہ بھی یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ ہمارے قوانین اور دین کے تقاضے ایسے بے لاگ ہیں کہ اگر خود اہل ایمان بھی اُن کی خلاف ورزی کریں گے تو ہم ٹوکیں گے اور یہ عمل بجائے خود اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بنا۔

اور یہ طریقہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی تھا۔ اُن کی تقاریر اور ہدایات اور اشارات میں بسا اوقات "اپنوں" پر سخت گرفت کی گئی ہے۔

یہی جذبہ میرے اندر کام کر رہا ہے۔

۴ — پیچیدگی یہ ہوئی کہ آپ نے اہلِ خاندان کی گفتگو گلی سے گزرتے ہوئے سنی۔ اتنے پر اکتفا کر لیتے تو مناسب تھا۔ آپ باہر ہی سے بول پڑے اور گفتگو میں حصّہ لینا چاہا۔ اور دعویٰ کر دیا کہ دیکھا تم نے بھی فریق کچھ مان لیا جو ہم کہتے تھے۔ میں درونِ خانہ کے "اپنوں" سے بات کر رہا تھا اس لیے میرا انداز کتنا بھی سخت ہوتا (اور وہ سخت نہیں ہے) اس کی نوعیت دوسری تھی۔ اور آپ اگر اپنی طرف متوجہ کریں تو پھر انداز مختلف ہونا چاہیے۔ اندریں صورت میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے مداخلت کر کے میرے مقصد کو نقصان پہنچایا ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات میری گفتگو کو اب غلط معنی میں لیں۔ بنا بریں لازم ہو گیا ہے کہ آپ سے کچھ گذارشات کروں۔

میں آپ کے نوٹس میں یہ ضروری بات لانا چاہتا ہوں کہ آپ میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔ میں اس فرق کو واضح کرتا ہوں۔

اوّل یہ کہ میں اپنے جس حلقۂ احباب کے ساتھ چل رہا ہوں اس کے ساتھ پورا پورا حسنِ ظن رکھتا ہوں۔ یہ عنصر بعض کمزوریوں یا وقتی غلطیوں کے باوجود معاشرے کا بہترین عنصر ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے پیشرو آدمی سے لے کر پس رَو آدمی تک بہ حیثیت مجموعی صاف نیّت لوگ ہیں اور سب کے سب دین کے غلبہ و استحکام کے تمنائی ہیں۔ انہوں نے نصب العین کبھی تبدیل نہیں کیا، اس کے لیے تدابیر تبدیل ہوتی رہی ہیں اور مختلف اقدامات کا تجربہ کیا جاتا رہا ہے۔ ان تدابیر اور تجربات میں غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں، مگر کسی کا اصل منشا غلطیاں کرنا نہیں، بلکہ دین کے مطلوب کو حاصل کرنا ہے۔ آپ کے اندر یہ حسنِ ظن باقی نہیں، آپ ان لوگوں کو فسادِ نیّت اور ترکِ مقصد کا الزام

دیتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ میں جو کچھ سوچتا ہوں دین سے محبت رکھنے والے دوستوں کی بھلائی کے لیے سوچتا ہوں، میں اُن کے درمیان رہنا اور اُن کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔ میرا کوئی ارادہ نہیں کہ اُن کی زجر و توبیخ کر کے اُن سے بھاگ جاؤں، یا پانچ پیڑھا کہ کہوں کہ میری بات مانو ورنہ میں چلا۔ جناب پر یہ واضح رہے کہ ایسے اصلاح پسندوں کی ایک ٹولی بالکل شروع میں، اور ایک ٹولی پاکستان میں عین حالت معرکہ میں کنارہ کش ہو گئی تھی، مگر زجر و توبیخ کر کے ان "واک آؤٹ" کرنے والوں کے غلط طرزِ عمل سے کسی طرح کا حصولِ خیر نہ ہو سکا۔ دوسروں کی اصلاح تو وہ کیا کرتے، انقطاع کے بعد وہ خود بھی لوٹ کر اپنے سابق مشاغل کی طرف چلے گئے۔ اور اقامتِ دین کی جدوجہد تمدنی و اجتماعی دائرے میں زیادہ بہتر طریقے سے تو کجا، کسی کم تر طریقے سے بھی نہ کر سکے۔ میرا طریقہ زجر و توبیخ کا طریقہ نہیں ہے جس کے آگے پھر "واک آؤٹ" ہی کا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے[1]۔ میں اپنے بھائیوں سے پہلے بھی اختلاف کرتا رہا ہوں، اب بھی کر لیتا ہوں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ تو رہے گا۔ میں اُن پر تنقید بھی کرتا ہوں اور وہ مجھ پر کر لیتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ یگانگت سے ہوتا ہے اور "اختلاف اُمتی رحمۃ" کے مطابق۔ اختلاف سے افتراق پیدا نہیں ہوتا۔

تیسرا یہ کہ میرا اور آپ کا (اور کنارہ کش ہونے والے دوسرے اربابِ علم و تقویٰ کا) ایک فرق یہ ہے کہ میں جن سے باتیں کر رہا ہوں، اُن میں سے ایک ہوں، اُن جیسا ہوں، اُن سے افضل نہیں ہوں اور ان پر ایمان و تقویٰ کی برتری کا مجھے ذرا بھی زعم نہیں ہے۔ بلکہ اُن کے سامنے اُستاد یا مرشد بن کر نہیں جاتا۔ دوست بن کر جاتا ہوں، انہوں نے تاریخ کے مراحل سے گذرتے ہوئے زخم کھائے ہیں اور مجھے بھی معرکوں

---

[1] ہونے سانے کام کو نقصان پہنچانے، اور پھر خود بہتر کام کر کے نہ دکھانے کی وجہ سے بیشتر حضرات میں ایک چھپا ہوا احساسِ ندامت موجود ہے جسے وہ غیر شعوری ذہن سے آگے آنے نہیں دیتے، مگر اس کا دباؤ برسوں سے اُن کو بحث در بحث کے چکر میں ڈالے ہوئے ہے، وہ برابر غلطیاں پکڑنے میں مصروف ہیں اور کہیں جا کر نہ اُن کا اظہارِ اختلاف مکمل ہوتا ہے اور نہ مخفی جذبات کی تسکین ہوتی ہے۔ اُلٹا وہ خود غلطیوں پہ غلطیاں کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ہیں چوٹیں لگی ہیں ۔ وہ بھی کئی بار گر کر اٹھے ہیں اور میں بھی اپنی تگ و تاز میں پچھڑ پچھڑ کر آگے بڑھا ہوں۔ اگر میرے بھائیوں کے تلووں میں آبلے ہیں تو میرے بھی ٹخنے چھلے ہوئے ہیں ۔ ہم ایک دوسرے کے محرم اور محب ہیں ۔ اُن کے زخم میرے زخم، اور میرا درد اُن کا درد ہے ۔ ہماری کمزوریاں اور غلطیاں آپس میں مربوط ہیں اور اُن کا ازالہ بھی واعظانہ انداز سے نہیں کیا جاسکتا، مل جل کر ہی کیا جاسکتا ہے ہم ایک دوسرے کی چارہ گری کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے ۔

ہم ایک دوسرے کے زخموں پر فتوے نہیں لگا سکتے، ایک دوسرے کی چوٹوں کا مذاق نہیں اُڑا سکتے ہمارا فلسفہ یہ نہیں کہ جس نے شیطانی قوتوں سے لڑتے ہوئے اُن کے ہاتھوں کوئی زخم کھایا ہو یا لڑائی میں کوئی غلطی کر دی ہو وہ قابلِ ملامت آدمی ہے ۔ قابلِ ملامت آدمی وہ ہے جو زخم آنے یا غلطی صادر ہونے کے ڈر سے سرے سے "ترکِ ستیز" کر دے ۔ آپ حضرات کا راستہ یہیں سے ہم سے الگ ہوجاتا ہے ۔ کہ چونکہ اقامتِ دین کی سعی میں لغزشیں بھی ہو جاتی ہیں اور چوٹیں بھی کھانی پڑتی ہیں، اور کبھی کوئی غلط بات بھی صادر ہو جاتی ہے، لہٰذا اس تحریکی سعی ہی کو چھوڑ کر انفرادیت کی کٹیا میں اللہ اللہ کرنا چاہیے جہاں آدمی ہر قسم کی گرد اور آلائش سے پاک ہو کر بیٹھ سکتا ہے ۔

فی الوقت یہی دو تین اشارات مکتفی ہوں گے ۔ اُمید ہے کہ اس سے وہ عظیم فرق واضح ہو جائے گا جو ایک ہی طرح کی بات آپ سے اور مجھ سے صادر ہوتے ہیں موجود ہے ۔

۵ ۔۔۔ غیر سیاسی دینداری اور تقویٰ جس کا فرنوں سے دَور دورہ رہا ہے، اس کے لیے پہلے تو دین و سیاست کی وحدت کا نظریہ قابلِ ہضم نہ تھا، اور اس پر بڑے اعتراضات تھے ۔ اسی سلسلے میں تحریک اور نظام اور انقلاب کی اصطلاحات شروع میں دینی طبقے کو غیر دینی محسوس ہوتی تھیں ۔ دین و سیاست کی وحدت کا اصول تسلیم ہونے کے معنی اوّل روز ہی یہ تھے کہ حکومتوں کے بننے اور ٹوٹنے اور قوانین کی تدوین اور نفاذ اور بجٹ اور مالیات کے مسائل سے اہلِ دین کو دلچسپی لینی ہو گی ۔ دلچسپی بھی اسی حد تک نہیں کہ حلال و حرام بتا دیا ۔ اور حالات کو اپنی رفتار پر چلنے دیا، بلکہ حالات کی رَو کو متاثر کر کے اُسے صحیح سمت موڑنے کی کوشش کرنا لازم ٹھیرا ۔ بات یہاں تک آجائے تو پھر بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ انتخابات سے علیحدہ رہ کر پورا کام کرنا ممکن نہیں ہے ۔ آپ پاکستان کو اپنی جگہ رہنے دیں، مصر میں اور ترکیہ میں اور انڈونیشیا اور دوسرے ممالک میں دیکھیں کہ انتخابی عمل کی کیا اہمیت ہے ۔

اور دین کا غلبہ چاہنے والوں کا اس عمل سے مقاطعہ جاری رکھنا ممکن نہیں ہے۔

آپ کو اعتراضات دو ہیں۔ ایک یہ کہ اس کوشش میں ناکامی ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ اس میں اہل دین کے لیے آلائشیں ہیں۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر سادہ دعوتِ دین بشکل وعظ گوئی پیش کرتے ہوئے ناکامی یا کم کامیابی پیش آئے تو کیا اس دلیل سے کام کو ترک کر دینا چاہیے کہ کامیابی نہیں ہوتی یا جلد نہیں ہوتی یا کافی نہیں ہوتی۔ اگر یہ درست ہوتا تو حضرت نوح علیہ السلام سال دو سال نہ سہی، تیس چالیس سال میں دعوتِ حق (جو ابھی ابتدائی مرحلے میں ہنتی) کا سلسلہ ترک کر دیتے۔ اصل سوال یہ ہے کہ دین کے غلبے کے لیے ایک کام کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری ہے تو معیار ظاہری کامیابی و ناکامی نہیں ہے۔ سامنے ہی میں یہ کہتا ہوں کہ ان اثرات کو نہ بھولیے جو پاکستان کے دستور، اس کے قوانین اور پالیسیوں پر مسلسل پڑتے آ رہے ہیں۔ غلام محمد اور سکندر مرزا کا دور ہو یا ایوب صاحب کا، پیپلز پارٹی کا زمانہ ہو یا موجودہ مارشل لا کا، ہر دور میں دینی تقاضوں کی راہ پر حکومتی پہلو سے پیش قدمی ہوتی ہے۔ اس کا سبب وہ کام ہے جو تحریکِ دستورِ اسلامی سے لے کر انتخابات ۷۷ ۱۹ء تک کیا جاتا رہا ہے۔ اس سرے پر قرار دادِ مقاصد کا پاس ہونا، بیچ میں قادیانیوں کا اقلیت قرار پانا۔ اور اب بعض شرعی قوانین کے اجراء کے سامنے زکوٰۃ کے نظم کا نفاذ آنکھوں سے دیکھے جانے والے شواہد ہیں کہ یہاں کوئی کام کیا گیا ہے جس کے اثرات رائے عام کی فضا میں موجود ہیں اور جس کی وجہ سے بڑے سے بڑا انحراف پسند بھی مخالفِ اسلام راستے پر نہیں بڑھ سکا۔ یہ سارا کام اُس اثر اندازی کے نتیجے میں ہوا ہے جو انتخاب میں شرکت کر کے، اور فتح پا کر بھی، اور شکستیں کھا کر بھی دینی تحریک پیدا کر سکی ہے۔ سو یہ دنیا جس میں انتخابات بہر حال ہو رہے ہیں، اس میں آپ حکومت سازی کے اس طریق سے انقطاع نہیں کر سکتے۔

پھر ان ناکامیوں کا بھی بس ایک ہی سبب نہیں کہ عوام کو تیار نہیں کیا گیا ــــ اگرچہ اس پہلو سے کمی رہ جانے کے اثرات بھی بہت ہوتے ہیں ــــ بہت بڑا سبب یہ ہے کہ عالمی سطح پر ملحد، سیکولر، مادہ پرست اور اسلام دشمن قوتوں کا ایک گٹھ جوڑ کام کر رہا ہے جو اسلامی تحریکوں کے خلاف عالمی ذرائع ابلاغ، پریس، علمی لٹریچر، ادبی کتب، رسائل و جرائد، اشتہارات، تصاویر، سازشوں، جارحیتوں اور قتل مقاتلے کے ذرائع سے کام کر رہا ہے۔ اس کا ایک ہدف یہ ہے کہ کسی ملک میں اسلامی عنصر

کو اُبھرنے نہ دیا جائے۔ اس کے لیے پیسہ بھی خرچ کیا جاتا ہے، خفیہ چالیں بھی چلی جاتی ہیں، لوگوں کو آلۂ کار بھی بنایا جاتا ہے اور سیکنڈل بھی گھڑے جاتے ہیں۔ باہر والے یہ تک طے کر لیتے ہیں کہ فلاں پارٹی کو برسرِ اقتدار لانا ہے اور فلاں فلاں اشخاص کو صدر اور وزیراعظم بنوانا ہے، پھر ان کے متبادل افراد بھی نشان زدہ کر لیے جاتے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ بنگلہ دیش بننے سے پہلے کے انتخابات ۱۹۷۰ء میں وہاں کی مضبوط ہندو اقلیت، سیکولرازم کے قائلین، عیسائی، اباحیت پسند مسلمان سب ایک قطار میں جمع ہو گئے اور ان کا منفی ہدف یہ تھا کہ کسی دینی شخصیت کو اُبھرنے نہ دیا جائے۔ چنانچہ مجیب صاحب کی عوامی پارٹی بھرپور طور پر برسرِ اقتدار آ گئی اور غلام اعظم صاحب کا گروپ ملک بھر میں دوسری پوزیشن پر رہا۔ یعنی مقابل کا گٹھ جوڑ اگر اُس طرح نہ ہوتا تو نتائج مختلف ہوتے۔ یہی صورت ہمیں پاکستان میں پیش آئی ہے۔ متذکرہ قوتیں جن میں کمیونسٹ اور قادیانی شامل ہوتے ہیں ایک محاذ بنا لیتی ہیں کہ دین کے علمبردار لوگ نہ آئیں بلکہ اُن کے مقابل میں "لادین مسلمان" نہیں تو کم از کم کمزور مسلمان کامیاب ہوں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ پھر تو کبھی کامیابی ممکن نہیں۔ جی درست، اگر انتہائی بزدلی ہوگی۔ اگر محض اس بنا پر میدانِ مقابلہ کو چھوڑ دیا جائے کہ مخالفِ اسلام عالمی قوتیں مزاحم ہیں۔ ہمیں تو ۔۔۔ کو چیلنج کرنا چاہیے۔ تا آنکہ وہ وقت آجائے کہ اُن کے باندھے ہوئے بند میں شگاف پڑ جائیں۔

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے

جنابِ محترم! جب تک دین برحق کے محاذ پر ایک بھی سپاہی طاغوتی قوتوں کو چیلنج کرنے کے لیے موجود ہے۔ اس وقت تک شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس دن معرکہ آرائی کے میدان میں کوئی علمبردارِ اسلام نہ رہا۔ اُس دن چاہے انفرادیت کی خانقاہ کتنی ہی آباد ہو، تمدنی قوت کے لحاظ سے ملت شکست خوردہ ہو گی۔

ہماری کوشش یہ ہے کہ یہ نبرد جاری رہے اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ہم دو کو تین سے اور تین کو چار سے لڑانے کے لیے اُٹھے ہیں۔ مگر لڑائی حق کی لڑائی ہے۔

۶۔ اب لیجیے انتخابات میں دینی کوتاہیوں یا اخلاقی لغزشوں کا معاملہ!

ہم لوگ سیاست کے بالکل نئے دائرۂ کار میں کام کرنے نکلے ہیں جہاں قریبی دور کے اہلِ تقویٰ نے بہت کم نقوش چھوڑے ہیں۔ خصوصاً انتخابات کا میدان تو ایسا ہے جس میں خالص دینی جذبے سے کوئی معرکہ لڑا ہی نہیں گیا۔ یہ میدان جس میں غلط قوتوں نے عرصۂ دراز سے گندگی پھیلا رکھی ہے، اس میں اگر ہم آویزش کے لیے نکلتے ہیں تو کچھ عجب نہیں کہ آلائشوں سے ہمیں سابقہ پیش آئے۔ مصیبت محض آلائشوں کا ہونا نہیں، بلکہ مصیبت تو یہ ہوگی کہ دینی لوگ آلائشوں کو آلائشیں نہ سمجھیں بلکہ ان کو زینت سمجھیں۔ پھر آپس میں وہ لوگ ایک دوسرے کو توجہ دلانے والے بھی نہ ہوں کہ بھئی کچھ آلائشیں ہمارے دامن و آستین پر لگ گئی ہیں، آؤ انہیں صاف کرلیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی ہمارے ہاں آلائشوں کو آلائشیں سمجھا اور محسوس کیا جاتا ہے اور محسوس کرایا جاتا ہے اور لوگ ان سے نجات پانے کی فکر کرتے ہیں۔

لیکن وہ صاحبِ تقویٰ جو محض اس بنا پر سیاسی و انتخابی آویزشوں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے کہ یہاں آلائشوں کا بھی خطرہ ہے، اس کا بے آلائش رہنا اسے اُخروی بازپرس سے نہ بچا سکے گا —— ٹھیک ہے یہاں کیچڑ پھیلی ہوئی ہے، ٹھیک ہے یہاں گوبر ہے۔ ٹھیک ہے یہاں سڑا ہوا پانی ہے، مگر میدان کارزار یہی ہے۔ معرکہ بھی لڑئیے اور اسے صاف کرنے کی سعی بھی کیجیے اور اپنے آپ کو ہر بار پاکیزگی کے معیار پر بھی لائیے۔[1]

یہ سوچنا کہ کوئی ایسا غیر انتخابی یا انتخابی نظام بن جائے جس میں چند خواص کو ووٹر بننے کا حق ہو، میرے نزدیک ایک بیکار خیال آرائی ہے۔ آخر کسی ملک کی اکثریت (جس میں غیر مسلم بھی ہوں اور بگڑے ہوئے یا غافل مسلمان بھی) یہ قربانی کیوں دے کہ وہ ایک اقلیتی گروہ کو سارا اقتدار سونپ کر خود ہر قسم کی سیاسی دخل اندازی سے کنارہ کش ہوجائے، بالکل غیر ممکن بات ہے۔ کسی جبری یا جذباتی کیفیت میں قلیل مدت کے لیے ایسا ہو سکتا ہے، مگر یہ کوئی مستقل راہِ عمل نہیں ہے۔ جو اصحاب یہ سمجھتے ہیں

---

[1] کچھ تازہ تجربات آپ کو "ممبر" بننے کے بعد بھی ہوتے ہوں گے۔ سوچنے کا ایک پہلو یہی نہیں کہ آپ کی قبا پر چھینٹے کیسے پڑتے ہیں۔ توجہ طلب امر حقیقت یہ ہے کہ برائی کس زور سے اُمڈ رہی ہے اور کیا جرأتیں دکھا رہی ہے، کیونکہ اسے روشنی و نیکی کی کسی قوت نے پہلے چیلنج نہیں کیا تھا۔

کہ وہ اکثریت کے اندر رضا کارانہ جذبات پیدا کرسکے اس قربانی کے لیے آمادہ کر لیں گے ، ان سے عرض ہے کہ پھر وہ اسلام کے مبادیاتی تقاضوں ہی کے لیے ان میں رضا کارانہ جذبات پیدا کر دیں ، باقی مراحل درست ہو جائیں گے۔

یہ درست کہ کسی بگڑے ہوئے معاشرے میں رائے دہی بالغاں کا طریقہ آسانی سے مطلوبہ نتیجہ نہیں دے سکتا ، خصوصاً جب کہ اندر اور باہر کی قوتیں اس میں طرح طرح سے خلل اندازی کرتی رہتی ہوں مگر مجبوری یہ ہے کہ سوائے اس کے سیاسی عمل کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

البتہ یہ الگ بات ہے کہ اسلامی انقلاب کا تکمیلی ظہور ضروری نہیں کہ انتخابات ہی کے ذریعے ہو۔ اور بھی راستے ہیں جن سے انقلابات ظہور پاتے ہیں اور پیشتر سے کوئی نہیں جانتا کہ کس ملک میں کب کیا ہوگا۔ اصل چیز یہ مطلوب ہے کہ سیاسی عمل جاری رہے ، اس میں اہلِ دین اثر انداز ہوں اور یہی اثر اندازی بڑھتے بڑھتے آخری مرحلے میں اپنے نتائج دکھائے۔

۷۔ انتخابات محض قومی انتخابات ہی نہیں ہوتے ، یونیورسٹیوں میں ، مزدوروں میں ، مختلف پیشوں کے کارکنوں میں یونین ازم موجود ہوتا ہے۔ اور ان کے لیے بھی انتخابات ہوتے رہتے ہیں۔ یعنی انتخابی عمل ہر شعبۂ زندگی میں پھیلا ہوا ہے۔ ان سارے شعبوں میں شرکت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اگر پاکستان کے اسلام پسند طلبہ منظم نہ ہوئے ہوتے اور انہوں نے سرخ عناصر کو انتخابی میدان میں کبھی چیلنج نہ کیا ہوتا تو آج ہر طرف کمیونسٹوں کا غلبہ ہوتا جس کے محض تسلط ہی سے آپ کی آئندہ نسلوں کا رُخ بدل جاتا۔ آج آپ اسلامی جمعیت طلبہ میں کتنی ہی کوتاہیاں تلاش کر دکھائیں ، اسی کے دم سے آپ کی تعلیم گاہوں میں اسلامی رجحانات کے لیے مواقع موجود ہیں۔

ایک دور وہ تھا کہ معاشرے میں صرف حکومت کا ادارہ منظم ہوتا تھا ، اب نئے سے نئے منظم ادارات وجود میں آگئے ہیں۔ اور ہر ادارہ اپنی انفرادی وسعت اور تنظیمی قوت کے لحاظ سے سیاست و معیشت میں مؤثر پارٹ ادا کرتا ہے۔ یہ ادارے سیاسی ہوں یا غیر سیاسی ، مطالبے اٹھاتے ہیں۔ ریزولیوشن پاس کرتے ہیں ، جلسے کرتے ہیں ، پریس کانفرنسیں بلواتے ہیں ، جلوس نکالتے ہیں ، مظاہرے کراتے ہیں ، ہڑتالیں اور بھوک ہڑتالیں کراتے ہیں ، اور ان مختلف تدبیروں سے حکومت یا سرمایہ دار طبقے یا سیاسی جماعتوں پہ دباؤ ڈالتے ہیں۔

کیا آپ جدید دور کے تمام منظمات سے قطع نظر کر لیں گے، ان کے اندر کام کرنے کی راہیں نہیں نکالیں گے؟ اُن کے اندرونی انتخابات سے دلچسپی نہیں لیں گے اور اُن کے پروگراموں اور منصوبوں کو غلط رُخ سے ہٹانے کی مساعی نہیں کریں گے؟

جی ہاں، معروف دینداری اور علماء کے ٹکسالی تقویٰ کو معاشرے کے سمندر کی ان ساری موجوں اور رَووں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ جدھر سے چاہیں اُٹھیں اور جس طرف چاہیں چل جائیں، اور جس شے کو چاہیں لپیٹ میں لے لیں۔ سکہ بند دینی رسائل میں غلط بنیادوں پر قائم ہو کر معاشرے کو بگاڑنے والے منظمات پر اس نقطۂ نظر سے کبھی کوئی بحث میں نے نہیں دیکھی کہ اگر ہم غلط منظمات پر قابو نہیں پا سکتے تو صحیح تر منظمات کو وجود دیا جائے جو ایک جوابی طوفان کی حیثیت سے تخریبی طوفان کو روک دیں۔ جی نہیں، بھلا یہ مسائل و معاملات دینی بحثوں کا موضوع کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ تو دُنیاداری کی باتیں ہیں اور باطل کے مشغلے!

مگر خوب سمجھ لیجیے کہ موجودہ دُنیا میں مختلف نوع کے خفیہ اور ظاہری ادارے اور منظمات نہ صرف قوموں کی حد تک بلکہ بین الاقوامی سطح پر موجود ہیں اور اُن سے مسلمانوں کا بے تعلق رہنا ممکن نہیں رہا ہے۔

آپ ایک انتخابی قضیے پر اُلجھے بیٹھے ہیں، آج کے معاشروں میں تو اور بہت کچھ محاذ آرائیاں ہو چکی ہیں اُن سے تعرض کیجیے تو طرح طرح کی اُلجھنیں پیش آتی ہیں اور جگہ جگہ آلودگیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پھر کیا منشاء یہی ہوگا کہ ان سارے جھگڑوں ٹنٹوں کو چھوڑ کر مدارس کے مصلّوں، مساجد کے منبروں اور تکیوں کے مونڈھوں پر بیٹھ کر دین کی خدمت کی جائے اور کچھ تبلیغی دَورے کر لیے جائیں۔

مَیں یہ نہیں کہتا کہ نئے دَور کی اجتماعیت کے پیچیدہ دائروں میں کام کرتے ہوئے ضرور غلطیاں کی جائیں؛ مَیں یہ کہتا ہوں کہ یہ میدان ہائے کار ایسے صعب و دشوار ہیں، نیز ان کے متعلق اہلِ تقویٰ کے پہلے سے تجربات موجود نہیں ہیں، اس وجہ سے جو نئے لوگ کام کرنے اُترتے ہیں وہ بار بار لغزشیں کھاتے ہیں۔ آپ اگر اجتماعیت کے جدید پیچیدہ دائروں میں لغزشوں کے بغیر کام کرنے کا کوئی مشاہدہ کرا دیں تو سب سے پہلے مَیں آپ کا قدردان ہوں گا اور یہ سمجھوں گا کہ اجتماعیت کے جنگل میں سے ان بزرگ نے خدمتِ اسلام کا ایک اہم راستہ نکالا۔ تاریخ پر یہ بڑا احسان ہوگا۔

۸ — اُوپر کے اشارہ نمبر میں جو گفتگو ہوئی ہے اسے ذرا سا اور آگے بڑھائیں تو بے حد تشویشناک

صورتِ حالات سامنے آتی ہے۔

ہمارے اس دَور میں انسانی تمدن و معاشرے کے ڈھانچے کو بعض نئے احوال نے اس درجہ مسخ کر دیا ہے کہ اس ڈھانچے میں کام کرنے والوں کے لیے آئندہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا کہ ایک خاص قسم کے حالات میں کیا حق ہے اور کیا باطل، تقویٰ کی راہ کدھر سے جا رہی ہے اور فتنہ کی کدھر۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

ہڑتال اس دَور میں ایک نئی شکل اختیار کر چکی ہے۔ بسا اوقات ہڑتالیں اتنی وسیع الاثر اور طویل ہوتی ہیں کہ حکومتیں معطل ہو جاتی ہیں، وزارتیں جھک جاتی ہیں اور نئے دستوری و قانونی فیصلے کرنے یا پالیسیوں کو بدلنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہڑتال جائز ہے؟ آپ کی نظر میں ناجائز اگر ہے تو وہ تو مسلمانوں کے لیے ہو سکے گی، لیکن اگر ہڑتال کو اسلامی مساعی ہی کو دبانے کے لیے استعمال کیا جائے تو کیا فتویٰ ہوگا؟ ہڑتال کرنے والوں کا حکم کیا ہے اور ہڑتال کے آگے جھکنے والی حکومت یا سرمایہ دار قوت یا کسی سیاسی پارٹی پر کیا حکم لگے گا؟ کیا ہڑتال کی قوت کو مسلمان بھی غیر اسلامی رجحانات و اقدار کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں؟ اگر کر سکتے ہیں تو پھر اس کے کچھ تفصیلی متعلقات بھی ہیں۔ ہڑتال کے لیے ہجومی قوت کا لزوم، اس میں نعرہ بازی، ہڑتال کو ناکام بنانے والوں کے متعلق رویہ وغیرہ۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ نہ تو ہماری فقہ میں ہڑتال کا کوئی باب ہے، نہ اس سلسلے میں نئے دَور کے عالموں نے کوئی فتاویٰ جاری کیے ہیں، نہ ارباب اقتدار ایسے کسی ہنگامے سے موافقانہ یا مخالفانہ تعلق رکھتے ہوئے آسانی سے ہر جزئی اُلجھن میں حکم لگا سکتے ہیں کہ تقویٰ کا وزن کس طرف جانا چاہیے یا کس طریق پر چلنے سے تقویٰ بڑھے گا!

اسی طرح اس دَور میں ایک ناپسندیدہ کردار چھاپہ ماروں کا ہے۔ بلیک ستمبر اور بلیک دسمبر جیسی تحریکوں کے مامور کردہ افراد کسی ممتاز شخصیت یا طیارے پر جب قبضہ کر لیتے ہیں تو جب تک وہ ناکامی سے دوچار نہ ہو جائیں متعلقہ حکومت کا حاکمانہ اقتدار اور ملکی دستور سب کچھ دو تین افراد کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے مطالبات منواتے ہیں کہ فلاں مجرموں کو رہا کر دیا جائے، اتنی رقم فراہم کی جائے، فلاں مقام تک پہنچنے کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جائے، اور یہ چھاپہ مار بھی ایک خاص صورتِ حالات

کے پیدا کردہ ہیں۔ مثال کے طور پر اہلِ فلسطین کو لیجیے جنہیں اُن کے وطن سے سب کچھ چھین کر نکال دیا گیا اور جو رہ گئے ہیں وہ انسانی حقوق سے محروم ہیں اور جو جیلوں میں جاتے ہیں وہ خوفناک اذیتیں بھگتتے ہیں۔ ان حالات سے کوئی راہ نجات نہیں۔ بے بسی کی اس کیفیت نے چھاپہ مار تحریکوں کو ظہور دیا اور انہوں نے دباؤ ڈالنے کے نئے طریقے نکالے۔ اپنے لوگوں کو ناروا ظلم کے چکر سے نکالنے کے لیے بے بس لوگوں نے یہ راستہ ڈھونڈا۔ دوسری جگہ پر بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

اب جزء بہ جزء اس معاملے میں حکم لگا کر دیکھیے کہ کیا چیز کہاں تک جائز اور کیا صورت کہاں تک ناجائز ہے۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ مختلف سوچنے والوں کی رائیں ایسے مسائل میں مختلف ہوں گی۔

اب آپ ذرا ترکی کے حالات پر نظر ڈالیں۔ وہاں کے کمیونسٹ جن کی بھرتی زیادہ تر مسلمانوں کے ایک اقلیتی گروہ سے ہو رہی ہے، روس کی پشت پناہی سے ترکی میں اسلامی تحریک کو ناکام بنانے کے لیے دائیں بازو کی مؤثر شخصیتوں کو قتل کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔ اب ایک شکل یہ ہے کہ دوسری جانب کے اکثریتی مسلمان جواباً کچھ نہ کریں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ قتل کے ذریعے مخالفِ اسلام سیاسی انقلاب انگیزی کی اس کوشش کو ناکام بنانے کے لیے مخالف محاذ کی جڑیں بھی کاٹیں۔ میں نہیں کہتا کہ وہ طریقہ درست ہے یا یہ صحیح۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ ان پیچیدہ حالات میں حکم لگانا آسان نہیں۔ زیادہ بہتر طور پر وہی لوگ سوچ سمجھ سکتے ہیں جو ایک صورتِ حالات سے عملاً دوچار ہیں۔

ایک تجربہ شام میں اخوان کا ہے۔ شام کی مسلم دشمن نصیری اقلیت (جو مسلمانوں کے مقابلے میں یہودیوں اور کمیونسٹوں سے زیادہ قرابت رکھتی ہے) کی جابرانہ حکومت کے خلاف اہلِ سنت کی اکثریت میں شدید اضطراب ہے۔ اخوان بہرحال اہلِ سنت کے حامی ہیں۔ چونکہ یہ ایک منظم قوت ہے لہٰذا حکومت نے اُسے کچلنے کے لیے قتل مقاتلے کا سلسلہ شروع کیا۔ اور جھوٹے الزامات میں اُن کے بڑے بڑے گروہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک شکل یہ ہے کہ اخوان اور اہلِ سنت دونوں مسلم دشمن جابر اقلیت کے ہاتھوں خوشی خوشی حوالۂ موت ہوتے رہیں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ ایسی بے حس و حرکت قربانی کے بجائے وہ جواباً ظالم قوت کو ضرب لگائیں۔ وہاں دوسری صورت اختیار کی گئی ہے۔ فرمایئے کہ فقہاء اور اتقیاء کیا حکم لگائیں گے۔

اسی طرح ایک صورتِ حالات ایران میں ہے، ایک آسام میں ہے، ایک افغانستان میں ہے۔ ان جگہوں پر جو واقعات ہو رہے ہیں اُن کا تجزیہ کر کے ہر چیز پر ایک حکم لگانا آسان نہیں رہا۔

اس کے لیے ایک نئی فقہ درکار ہے جو نصوص کو برقرار رکھ کر ان کے اجتہادی انطباقات کو نئی شکل دے۔ ان مختلف حالات سے گذرنے کے لیے ایک نیا احساسِ تقوٰی درکار ہے جو طرح طرح کے الجھے احوال وشئون سے گذرتے ہوئے بھی انسان کو اسی طرح اطمینان دے سکے جیسے وہ خانقاہی ذکر و دعا میں اور تبلیغ و تدریس اور افتاء کے کاموں میں دیتا رہا ہے۔

یہ بڑے بڑے معاملات جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور جن کے اندر سے دنیا کی بڑی بڑی اسلامی تحریکات گذر رہی ہیں، آپ جب ان پر غور کریں گے اور ان پر حکم لگانے کی کوشش کریں گے تو آپ کو چھوٹے درجے کی انتخابی الجھنیں بھول جائیں گی۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ پیچیدہ دائرے ہوں یا سادہ انتخابی دائرہ، کسی بھی جگہ خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کی جائے اور ہم نوجوان مسلمانوں کو یہ حوصلہ دلادیں کہ وہ جو چاہیں کریں۔ خدا کی پناہ، ایسے کسی تصور سے! میرا مطلوب صرف یہ بات ہے کہ اب تک جو سکہ بند تصورات چلے آرہے تھے، اب ان سے زیادہ وسیع تصورات کی ضرورت ہے اور وسعتِ نظر اور عالی ظرفی سے، بدلتی ہوئی دنیا کے احوال کی پیچیدگیوں کو دیکھنا چاہیے۔ تبھی ہم یا ہمارے علماء اس قابل ہوسکیں گے کہ نصوص کے بہتر منطوقات اور انطباقات سامنے لاسکیں اور تقوٰی کا زیادہ گہرا اور زیادہ بسیط تصور دلا سکیں۔

حال اور مستقبل کی تاریخ کی یہ وسعتِ آفاق ہمارے سامنے ہے۔ اور ہم کوشاں ہیں کہ نئی نسل غلبۂ اسلام کی کشمکش سے عہدہ برآ ہونے اور انتہائی پیچیدہ اور نادیدہ حالات میں خداخوفی سے صحیح حکم لگانے اور اس کی پابندی کرنے کے لیے تیار ہو سکے۔

براہ کرم ہمارے قصوروں اور کوتاہیوں کا حساب لگانے اور پھر ہم سے نفرت کرنے کے بجائے پیش آمدہ بھاری ذمہ داریوں اور مشکل مراحل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہماری کاوشوں اور فکرمندیوں اور مساعی کو دیکھ کر ہمیں نگاہِ شفقت و رحم سے بھی دیکھیے۔ ہم طوفان زدگان کے سامنے روایتی سبکسارانِ ساحل والا معاملہ نہ کیجیے۔

۹ ـــ مولٰنا مودودی اور ان کے متاثرین کی جتنی بھی غلطیاں کوئی پکڑتا اور اچھالتا رہے، ان کا کیا ہوا اصل بڑا کام ایسا ہے کہ اس سے بڑی کوئی نیکی آس پاس مجھے دکھائی نہیں دیتی۔

انھوں نے دعوتِ دین کو اس انداز سے پیش کیا کہ ایک طرف مغرب زدگی کا طلسم ٹوٹنے لگا اور

دوسری طرف جامد مذہبیت سے آگے تحریکی تصورِ اسلام کی راہیں واضح ہوئیں۔ نتیجہ یہ کہ بے شمار لوگ متاثر ہوئے، متحرک ہوئے، ذہن و کردار کے لحاظ سے تبدیل ہوتے۔ جو نسل ان کے دورِ شباب میں اُٹھ رہی تھی پہلے وہ کھنچ کر آئی۔ بعد میں موجودہ دور کی زیرِ تعلیم نئی نسل فسق و فجور کے ماحول اور آمریت و فتنہ گری کے طوفان کے باوجود دینِ حق کی راہ پر گامزن ہو رہی ہے۔

آپ کو تو ضرور اس کا اندازہ ہوگا کہ مودودی صاحب سے متاثرین نے کتنی قربانیاں دی ہیں اور کتنی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے۔ آج بھی یہ عناصر قبولِ حق، ترکِ مفاد، تحمل شدائد، مالی ایثار اور فروغِ دعوت کے لیے جان ماری کے لحاظ سے ایک اچھی مثال پیش کر رہے ہیں۔ ان کی نگاہیں اتنی وسیع ہیں کہ وہ نہ صرف اپنے قریبی معاشرے میں اُٹھنے والے ہر فتنے کو محسوس کر لیتے رہے اور ہر متحرک شخصیت اور گروہ کے مقام کا اندازہ کر لیتے رہے ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی مختلف قوموں، تحریکوں نظریات اداروں، سازشوں اور فتنوں کی شناخت کرنے کے اہل ہیں۔ بات صرف علم و شناخت تک ہی محدود نہیں، وہ غلط عوامل اور محرکات کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان کا ایک مستقل محاذ مخالفِ اسلام تحریکوں کے خلاف ملک ملک میں کام کر رہا ہے۔ اس متحرک مجاہدانہ قوت کے پاس لٹریچر کی قوت ہے تنظیمی قوت ہے، اس کے جابجا مختلف انداز کے ادارات ہیں، اور یہ سب کچھ پورے عالمِ اسلام کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔

ملت کا یہ ایسا اگلا مورچہ ہے کہ جس کی جانفشانیوں کی وجہ سے پیچھے کے تمام مذہبی حلقوں اور گروہوں اور اداروں کو زیادہ قدر و قیمت حاصل ہے۔ قدر و قیمت ہی نہیں، تحفظ بھی حاصل ہے مخالفِ اسلام عالمی قوتیں اور ملکی حکومتیں ہمیشہ اگلے مورچے پر یورش کرتی ہیں، جس پر متحرک سپاہی موجود ہیں۔ اس اگلے مورچے پر اگر پیچھے سے شبخون مارے جائیں گے تو پھر براہِ راست ہر مذہبی ادارہ اور گروہ زد میں آئے گا۔

پس قدر کیجیے اس دینی فکر اور عملی تحریک کی جس کی وجہ سے ملت کی نگاہیں ایک روشن نصب العین پر مرتکز ہوئی ہیں اور نوجوانوں میں حالات کی سنگینی کے باوجود اُمید اور عزم و حوصلہ ہے۔ اگر بار بار اگلے مورچے کے افراد کو آپ بے دینی اور انحراف اور عدمِ تقویٰ کے طعنے دیتے رہیں گے تو ملت کی اُمیدوں اور حوصلوں کو کچل دینے کا سبب بنیں گے۔ کبھی نیتوں پر حملہ، کبھی یہ الزام کہ مقصد بدل گیا

ہے یا مزاج بدل گیا ہے، کبھی یہ بحث کہ دینی تحریک سیاست زدہ ہو گئی ہے، کبھی یہ نزاع کہ انتخابات کی شرکت اخلاقی زوال کا باعث ہے اور اس کے ذریعے حاصل کچھ نہیں ہوگا، غرضیکہ اقامتِ دین کے لیے سعی کرتے ہوئے نوجوانوں کو الجھنوں میں ڈالنے اور عوام میں ایک اچھے بھلے کام کے خلاف شکوک و شبہات کے بیج بونے سے کوئی خدمتِ اسلام تو ہو نہیں سکتی۔ کسی بھی شخص یا گروہ یا ادارے کا ناپ تول کرنا ہو تو دیانت داری سے اس کی خدمات اور اس کی کوتاہیوں یا لغزشوں کو میزانِ عدل کے دونوں پلڑوں پر رکھیے اور پھر بتائیے کہ پلڑا کدھر جھکتا ہے، ورنہ یہ طرزِ فکر تو منصفانہ نہیں۔ ؏

کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا۔

۱۰۔ ہماری اور دوسروں کی ہزار لغزشوں اور کوتاہیوں سے بڑا گناہ اُمتِ محمدیہؐ میں افتراق پیدا کرنا ہے۔ یہ دَور جبکہ معاند قوتیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف متحد ہو کر ہر تدبیر و اقدام اختیار کر رہی ہیں۔ اس میں مسلم گروہوں کا ایک دوسرے کے خلاف جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہونا علامتِ خیر نہیں۔ آج تو پانی گلے گلے آچکا ہے۔ مخالف قوتیں مسلمانوں کے اُبھار کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہتی ہیں۔ فلپائن، ارٹیریا، فلسطین، اوگاڈین، افغانستان، آسام اور کشمیر میں مسلم دشمن قوتیں ہر قسم کے مظالم توڑ رہی ہیں۔ ایسے میں تو چاہیے تھا کہ ہمارے تمام گروہوں کے اکابر مل بیٹھتے اور طے کرتے کہ آپس کی معرکہ آرائیاں ختم، اب ساری قوت اسلام دشمن اور مسلم دشمن قوتوں کے خلاف متحد ہو کر صرف کی جائے گی۔ اس کے لیے نہ تو اہلِ علم کاوش فرما رہے ہیں اور نہ اہلِ تقویٰ کوئی کوشش کر رہے ہیں۔ بلکہ اُلٹا جو قوت پیش پیش ہو کر معرکہ آرا ہے، اسی کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کے لیے نیک لوگ کوشاں ہیں جیسے کہ سارا تقویٰ اسی کارنامے میں رکھا ہو۔

ذرا بنگلہ دیش بننے سے پہلے کے واقعات کی یاد تازہ کیجیے۔ آخری مرحلہ وہ تھا جب کہ کمیونسٹ، ہندو، سیکولر مزاج کے مسلمان بھارتی حکومت اور فوج کی پشت پناہی سے دینی قوتوں کو تباہ کرنے کے لیے میدان میں اُتر گئے تھے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف ایک دینی قوت اور ایک سیاسی قوت آگے بڑھی، بقیہ اہلِ دین کنارہ کش رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب مخالفوں کے چھرے اور گولیاں حرکت میں آئیں تو انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ کون نعیم صدیقی اور کون وصی مظہر ہے بلکہ صرف یہ دیکھا کہ دینی مزاج کا آدمی کون ہے اور دینی کام میں کون کون نمایاں رہے۔ نہ اس یورش سے تبلیغی جماعت کے

حضرات نہ بچے، نہ کوئی امام مسجد اور مؤذن — اِلّا یہ کہ کسی نے باتو دوسروں سے مل کر جوابی محاذ آرائی کی ہو یا فرار کا راستہ نکال لیا ہو۔

میں کہتا ہوں کہ اگر یہی متفرق دینی قوتیں متحد ہوتیں تو چاہے وہ معرکہ آرائی میں مٹ جاتیں مگر مخالفِ دین قوت کو وہ سبق سکھا دیتیں کہ پھر کبھی ایسی جرأت نہ ہوتی۔

یہ تو ہے ماضی کی بات جس نے حسرت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ سوچنا چاہیے مستقبل کے متعلق کہ آیا حوادث کے نئے ریلوں کا مقابلہ شانِ افتراق کے ساتھ کرنا ہے یا متحد قوت بن کر۔ اگر اتحاد کی دینی اہمیت سمجھ میں آسکے تو اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ ایمانیات میں جو عناصر کوئی بنیادی اختلاف نہیں کرتے ہیں۔ اور نہ ضروریاتِ دین میں سے کسی کے منکر ہیں اُن کو مسلم سمجھ کر بات کی جائے اور عبارتوں اور لفظوں کی چیر پھاڑ کر کے خواہ مخواہ کے الزامات اُن پر نہ چپکائے جائیں۔ جماعتیں، ادارے، مدرسے، فقہی تصورات اور معیاراتِ تقویٰ الگ الگ رکھ کر بھی آپ دفاعِ ملت اور اقامتِ دین کے کام میں جتنا جتنا ممکن ہو تعاون کر سکتے ہیں۔ کسی جزء میں آپ تعاون نہ کر سکیں تو نہ سہی، لیکن من حیث المجموع جادۂ حق پر ہمقدم ہو کر چلنا چاہیے۔ یہ نہیں تو پھر دو چار جزیرہ ہائے تقویٰ کے علاوہ اسلام صرف وہاں ملے گا جہاں جزیروں کے حاکموں کی مہر کردہ دستاویز پہنچے گی۔ پھر اپنے سوا سب کی کھل کر تکفیر کیجیے تاکہ اس مشغلے کے نتائج بھی بھرپور طور پر آپ کو ملیں۔ اگر دلوں میں نفرتوں کی بھاپ بھری ہوئی ہو، کبرِ علم و زہد ذہن پر مسلط ہو تو پھر اتحاد بین المسلمین کا کام ہو چکا۔

میں اپیل کرتا ہوں کہ ہم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابل میں حسد یا کبر کے جذبات نہیں رکھنے چاہئیں، ہم سب مسلمان ہیں، ہمارا مقصد غلبۂ اسلام ہے اور ہم مخالفِ اسلام عالمی محاذ کا مقابلہ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

اُمید ہے کہ میرا طرزِ فکر اِن گذارشات سے واضح ہو گیا ہو گا۔

"اشارات" میں جو بحث آ رہا ہے وہ ایک پہلو کی بات ہے، اور آپ نے جو قضیہ اٹھایا ہے، وہ اس کے برعکس دوسرے پہلو سے متعلق ہے۔ ان دونوں دائروں میں جو خیالات میں دے رہا ہوں، اُن کو باہم دگر ٹکرایا نہ جائے بلکہ ان کو ہم آہنگ کر کے پڑھا جائے۔ ایک طرف میری گفتگو یہ ہے کہ دین کے اصولوں اور اخلاق کی قدروں کو غالب رہنا چاہیے اور بنیادی دعوتِ اسلامی کے کام کو مستقلاً اہمیت دینی

[illegible] ورنہ ایسے سیاست اور عقائد
کا ترک درست نہیں ہے۔ نیز جو پیچیدگیاں دینداری اور انتخابی سیاست کو اکٹھا کرنے سے پیدا ہوتی
[illegible]
[illegible]
[illegible] آپس میں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں[1]

---

[1] ایک اور صاحب نے اشاعتی میدان میں گھی کا چراغ جلایا ہے۔ مگر ان چراغوں میں روشنی نہ رہے گی۔

مطبوعات

قائدِ اعظم محمد علی جناح
شخصیت و کردار

[illegible]

ناشر: ادارہ تحقیقات اسلامی
اسلام آباد

قیمت: -/۱۲ روپیہ

پاکستان کا نصب العین متعین کرنے کے لیے "تحریکِ پاکستان" کا فہم ضروری ہے اور جب تحریکِ پاکستان زیرِ غور آئے گی تو قائدِ اعظم کا نام ناگزیر ہوگا جیسے کسی عمارت کا تصور اس کی بنیاد کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

اگرچہ تحریکِ پاکستان کل کی بات ہے، مگر تہائی صدی کے زمانی فصل اور نئی نسل کی کم نگاہی سے فائدہ اٹھا کر غیر اسلامی نظریات و تصورات کے حاملین، اسلامی نظریۂ پاکستان کو گول کر جاتے ہیں اور مقصدِ پاکستان پر تحریف کا عمل کرتے ہیں، بلکہ قائداعظم کی تحریروں اور تقریروں کا وسیع ریکارڈ موجود ہونے کے باوجود اُن کے واضح تصورات کو مسخ کر دیتے ہیں۔ ان حالات میں ہر بڑی ضروری اور مفید خدمت ہے کہ جو بھی لوگ تحریکِ پاکستان کے محرکات و عوامل اور قائداعظم کے تصورات و تلقینات کو نمایاں کر سکتے ہوں کریں۔

راقم کے دوست پروفیسر کرم حیدری دانشوروں کی صف کے ایک فرد ہیں اور ان کی لکھی ہوئی یہ کتاب متذکرہ مقصد کو بخوبی پورا کرتی ہے۔ پہلے باب میں انہوں نے اجمالاً یہ بتایا ہے کہ پچھلی اسلامی تحریکوں کے اثرات جمع ہو کر تحریکِ پاکستان کا سرمایۂ قوت بنے۔ بلکہ اُن کا باندھا ہوا عنوان (...... کی ارتقائی شکل) سے تو مفہوم وہی نکلتا ہے جو احسان دانش نے "بہ مصرع میں" تمام جلوے سمیٹ کر کے الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ کم سے کم اتنا تو واضح ہے کہ پچھلی اسلامی تحریکوں کے اثرات نے ایک خاص طرح کا اسلامی نظریہ و نصب العینی تحریکِ پاکستان کو دیا۔ برصغیر میں ہماری احیائی تحریکوں کا یہ تسلسل خود شہادت دیتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کس اسپرٹ کے ساتھ اور کس مقصد کے لیے چل سکتی تھی۔ اس حقیقت کو اب غلط الفکر

دانشوروں کی کوئی فنی مہارت بدل نہیں سکتی اور نہ اسلامی مظاہر کی رَو کو روکا جاسکتا ہے جو پاکستان میں شدید مزاحمتوں کے باوجود زور پکڑ رہی ہے، جو کام مسلم لیگ نے شروع کیا تھا اُس کی تکمیل کے لیے اور قوتیں بھی تو کام کر رہی ہیں۔

پھر قائداعظم نے دو قومی نظریے اور جداگانہ مسلم قومیت کے شعور کو جس انداز سے اُبھارا اس کا ذکر ہے۔ پھر قائداعظم میں مومن کی بنیادی صفات کے موجود ہونے پر گفتگو ہے، اور آخری باب میں اسلامی آئین اور جمہوری معاشرے کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔

ضروری حوالوں اور اقتباسات سے آراستہ یہ مختصر کتاب (۸۰ صفحات) اپنے موضوع کا حق ادا کرتی ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ پروفیسر حیدری صاحب کی یہ کتاب اُن کی ایک غیر مطبوعہ کتاب کے اڑھائی سو صفحات کی تلخیص ہے جسے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے شعبۂ پاکستانیات نے تیار کرایا۔ وہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ خدا کرے اُس کی اشاعت بھی عمل میں آجائے۔

ایک مقام پر کھٹک ہوتی۔ مسٹر جمیل الدین احمد مرحوم (جو بڑا اشرافیانہ مزاج رکھتے تھے) کے ایک اقتباس (ص ۶۶) کا مفہوم مؤلف نے اپنایا ہے۔ وہ اس میں بعض معترضین کی تردید کرتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں لکھتے ہیں کہ " انہوں نے اپنے گرد مذہبی تقدس کا ہالہ نہیں بنایا ہوا تھا" — "عوام کے مذہبی جذبات اور تعصبات کا استحصال نہیں کرتے تھے" — "وہ مذہبی رسومات کی نمائش نہیں کرتے تھے" — "مذہبی یا منطقی موشگافیوں کا تانا بانا بھی نہیں بناتے تھے" — اختتام اس جملے پر ہے کہ لیکن "وہ دین کی رُوح سے نہ صرف باخبر بلکہ پوری طرح سرشار تھے" — سوال یہ ہے کہ "تقدس کا ہالہ" نہ سہی، لیکن کسی کے اندر فکری یا اخلاقی تقدس کا موجود ہونا تو مطلوب ہے۔ ورنہ کوئی مرحوم کی دیانت و امانت یا پابندیٔ وقت یا جمہوریت پسندی پر بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ انہوں نے ان خوبیوں کا اپنے گرد ہالہ بنا رکھا تھا۔ اگر کوئی شخص دین و مذہب سے سچی محبت کرے اور دینی اصولوں کے غلبے اور مذہبی اقدار کے فروغ کے لیے کام کرے گا تو وہ عوام کے دینی و مذہبی جذبات کو ضرور متحرک کرے گا۔ (اور یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ قائداعظم نے ایسا کیا۔ رہا کسی دھوکا دینے والے شخص کا استحصال کرنا تو جیسے وہ مذہبی جذبات کا استحصال کرسکتا ہے، ویسے ہی کوئی دوسرا شخص جمہوری رجحانات کا بھی استحصال کرسکتا ہے۔ کوئی تیسرا سیاسی مسائل کا، معاشی اضطراب کا، دفاعی ولولوں کا بھی استحصال کرسکتا ہے۔

مذہبی جذبات و تعصبات کی بات غلط ہے، کہ "استحصال" سے پرہیز کے لیے یہ لازمی نہیں کہ سرے سے مذہبی جذبات ہی سے کوئی فارغ ہو جائے، یا اُن کا تذکرہ نہ کرے۔ اور قائد اعظم نے مذہبی جذبات سے ایسی بے تعلقی نہیں رکھی ہے۔ کسی شخص کا مذہبی رسومات کی نمائش کے لیے اہتمام نہ کرنا اور بات ہے، اور مذہبی رسومات (میری مراد سنن، آداب، شعائر وغیرہ سے ہے) ہی کو خیر باد کہہ دینا اور بات ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی پروفیسر کرم حیدری جیسے مسلمان کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوگی کہ اسلام نے بعض رسومات کو سب کے سامنے یا اجتماعی طور پر پورا کرنے کی تلقین کی ہے۔ مثلاً۔ کیا "السلام علیکم" کہنے" یا "بسم اللہ" پڑھنے سے بھی رسومات کا عالم بن جاتا ہے جو کوئی مہلک شے ہے؟ ایسا ہے تو پھر رہے گا کیا! اسی طرح مذہبی یا منطقی موشگافیوں سے بھی کسی کو پاک دامن قرار دینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کسی طرح کی موشگافیاں نہ کرتا ہو۔ بہت سے لوگ سیاسی موشگافیاں کرتے ہیں۔ بہت سے قانونی موشگافیاں کرتے ہیں، آخر جو جس دائرے میں کام کرے گا اس میں جب بھی وہ بر بنائے ضرورت باریک نکتوں تک جائے گا تو اسے موشگافی ہی کہا جائے گا۔ اگر کوئی شخص دین یا مذہب کے احیاء یا اسلامی دستور یا اسلامی قانون یا اسلامی حکومت کے لیے کام کرے گا، اسے ان موضوعات پر نکتہ ہائے باریک بھی بیان کرنے ہوں گے۔ اسمبلی کا ہر سپیکر، ہر جج اور ہر وکیل اور ہر صنعت کار اور ہر تاجر اور ہر زمیندار اپنے اپنے دائرے میں موشگافی کرتا ہے۔ پھر کیا مطلب یہ ہے کہ اور تو سارے میدانوں میں ہر قسم کے موضوعات پر باریک بحثیں ہو سکتی ہیں۔ صرف دینی اور اسلامی امور پر نہیں ہو سکتیں۔ یہاں ہوں گی تو موشگافی بن جائیں گی۔ جن دوست کا اقتباس لیا گیا ہے، خود اُن کو بھی شاید لفظ موشگافی کے خاص مفہوم کا تصور حاصل نہ تھا۔ اس سے مراد ایسی بحثیں ہوتی ہیں جن کی کوئی حقیقی عملی ضرورت نہ ہو، محض نکتہ آفرینی اور نکتہ آرائی کا مشغلہ اختیار کر لیا جائے۔ رہیں زندگی کی عملی ضرورتیں تو ہر شعبے میں باریک بحثیں ہوتی ہیں اور نکتے اُٹھائے جاتے ہیں۔ اپنے اپنے کام میں تو ایک پٹواری اور ایک ناظرِ عدالت بھی باریک نکتے چھانٹنے پر مجبور ہوتا ہے۔ پروفیسر کرم حیدری صاحب ہی سمجھ سکیں گے کہ آیا جمیل الدین احمد مرحوم کی مراد یہ تھی کہ "اسلام" سرے سے قائد اعظم کا عملی میدان تھا ہی نہیں یا تھا تو سہی مگر یونہی سرسری، انہیں کبھی اس کے اصول و احکام اور ان کے تقاضوں پر سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہ تھی۔ آخری فقرے نے کمال کر دیا۔ اس اقتباس کی رُو سے دین ایک الگ چیز معلوم ہوتا ہے

اور ... کی روح الگ - ہمارے سامنے اس دینی روح کا بڑا غلط استعمال ہوا ہے۔ دینی روح، دینی زندگی ہی میں پائی جاسکتی ہے۔ ورنہ اگر دین کے عقائد، احکام عبادات اور شعائر مسنونہ کو ایک طرف [illegible] پھینک دیں اور کچھ دین کا جوہر نکال کر روح کیوڑہ کی طرح استعمال کرلیں۔

میرا یہ خیال ہے کہ اس طرح کی تحریریں تاریخ عالم کی شان کو بڑھاتی نہیں بلکہ اُن کی شخصیت کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ [illegible] ۱۹۴۶ء [illegible] سے علمبرداروں نے اپنی پسند کا مفہوم دینے کی کوشش کی ہے، اس کے متعلق قائداعظم اور پاکستان کے ایک [illegible]

بقیہ کتاب کے تمام مندرجات کا تفصیلی جائزہ تو ممکن نہیں، ایک عمومی تبصرے کے طور پر یہ کہوں گا کہ قطع نظر میرے مخلصانہ اختلافی نکات کے، یہ کتاب بہت مفید ہے اور اسے لائبریریوں اور اسکولوں میں خاص طور پر پہنچنا چاہیے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ ایک اچھی خدمت ہے۔

[illegible] تنخواہیں [illegible] دی گئی تاکہ پاکستان اول روز ہی سے [illegible] ۔ دو [illegible]
نے مدد کی کہ قائداعظمؒ کی ذاتی اپیل پر کاروباری طبقے نے حکومت پاکستان کو اتنے فنڈز فراہم کر دیے
[illegible] تنخواہیں [illegible]
قربانی دی کہ درختوں کے نیچے اسٹولوں اور دریوں پر بیٹھ کر کام کرنے لگے۔ اس وقت پنوں کی جگہ
کاغذوں کو جوڑنے کے لیے خاردار جھاڑیوں کے کانٹے استعمال ہوتے۔

تشکیلِ پاکستان [illegible] مسلم کشی [illegible]
آئے جو پہلے سے تنظیم و تربیت کے مراحل طے کر چکے تھے۔ تقسیم کا مرحلہ آنے پر مسلم کشی کی بہیمانہ کارروائی
[illegible]
[illegible] قتل عام ہی نہیں تھا، املاک کی تباہی کی مہم بھی [illegible]
بھی ہو رہی تھی اور مسلمانوں کی بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کو لاکھوں کی تعداد میں اغوا کیا جا رہا تھا اور
نشانۂ ہوس بنایا جا رہا تھا۔ زخمی اور بھوکے اور الم رسیدہ مسلمان گاڑیوں میں اور بڑے بڑے قافلوں
کی صورت میں پاکستان کی طرف لانگ مارچ کر رہے تھے۔ قدم قدم پر راستے میں ان پر حملے کیے جاتے
رہے۔ گاڑیوں کے پورے پورے مسافروں کو گولیوں اور برچھیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ قتل و غارت کے
اس ہنگامے سے ایک اور فائدہ ہندو قوم نے یہ مدنظر رکھا کہ پاکستان کی چھوٹی سی نوخیز مملکت پر
مہاجرین کی ایک بڑی تعداد کا بار پڑنے سے اول تو اقتصادی طور پر وہ بے جان ہو جائے گی۔ اور دوسری
طرف اس کے اندر سیاسی آویزشیں شروع ہو جائیں گی۔ خدا نے ان کے یہ دونوں مقاصد پورے
نہ ہونے دیے۔

لیکن یہ ساری کوششیں پاکستان کا بال بیکا نہ کر سکیں۔

تب بھارت نے پاکستان کے خلاف فوجی کارروائیوں کا آغاز کیا۔ پہلی کوشش پاکستان سے رن کچھ کا علاقہ
چھیننے کے لیے کی گئی، مگر بھارتی فوج کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔ یہ شاید پاکستان کی دفاعی صلاحیتوں کو ٹٹولنے
کی کوشش بھی تھی۔ دوسرا بڑا وار ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء میں بغیر کسی اعلانِ جنگ کے پاکستان پر کھلی فوج کشی کی
صورت میں کیا گیا، مگر اس بار بھی بھارتی خواب پریشان ہو گئے۔ جنگ بندی کے لیے معاہدۂ تاشقند
وجود میں آیا، جس میں بھارتی مفاد کا پلڑا بھاری تھا۔ روس کے دباؤ سے اس پر حکومت پاکستان کے دستخط

حاصل کئے گئے۔ مگر پاکستان دشمنی کی آگ پھر بھی ٹھنڈی نہ ہو سکی۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد سے پاکستان کے حصے کی ہندو اور سیکولر آبادی کے ذریعے آہستہ آہستہ مسلم قومیت کے خلاف بنگلہ علاقائی قومیت کو اُبھارنے کی مساعی شروع کر دی گئیں۔ یہ کوششیں جنگ ستمبر کے بعد تیز تر ہو گئیں۔ بھارتی سازش کاروں نے اگرتلہ میں اسکیم تیار کر کے شیخ مجیب کو سیاسی میدان میں علیحدگی کی تحریک اُٹھانے کے لیے اُتارا۔ دوسری طرف ہندو آبادی اور سیکولر ذہن کے مسلمانوں کو عوامی لیگ کے ذریعے کام میں لگا دیا، پھر سلسلہ اور آگے چلا تو چھاپہ ماروں اور گھس بیٹھیوں کے تربیت یافتہ دستے کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ انہوں نے بہاری مسلمانوں کے علاوہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ملازمین اور سول آبادی کے علاوہ خود فوجی دستوں پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ بھارت میں باقاعدہ ٹریننگ سنٹر کھل گئے۔ انہی حملہ آوروں کی پیدا کردہ بدامنی کی وجہ سے ہندو اور دوسرے عوام گھبرا کر ترکِ وطن کرنے لگے اور اُن کے لیے مہاجر کیمپ بھی کھول دیے گئے۔ خود اُن میں سے بھی چھاپہ مار تیار کر کے بھجوائے جاتے جو کچھ حملے اور دھماکے کر کے واپس پہنچ جاتے۔ ساتھ ہی بھارت نے پروپیگنڈے کا طوفان اُٹھا دیا۔ لیکن ان اُلٹی تدبیروں سے بھی جب کام نہ نکلا تو سیدھے سبھاؤ بڑے پیمانے پر فوج کشی کر دی گئی۔ نتیجہ یہ کہ پاکستانی افواج کو بے مثال بہادری کے باوجود ہزیمت اُٹھانا پڑی۔ تب اندرا گاندھی نے فرمایا کہ ہم نے مسلمانوں سے ہزار سالہ تاریخ کا انتقام لے لیا ہے۔ یہ ایک فقرہ بھارت کی پچھلی ساری، مسلم دشمن تاریخ کا گواہ ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ اصل مطلوب انتقام تھا۔

مفتوحہ مشرقی علاقہ جو اب بنگلہ دیش تھا، وہاں سے فوج اور سول ملازمین میں سے نوّے ہزار قیدی بھارت لے جائے گئے اور وہاں اُن کو سخت اذیت ناک حالات میں رکھا گیا۔ بعض افسروں کو غیر انسانی نوعیت کے شدید ٹارچر سے گذرنا پڑا۔ پھر ان قیدیوں کی رہائی کی قیمت کے طور پر وزیر اعظم پاکستان سے شملہ معاہدے پر دستخط کرائے گئے جو معاہدۂ تاشقند کا جدید تر ایڈیشن تھا۔

بعد میں کئی بار یہ دھمکیاں دی گئیں کہ ہم پاکستان کے اور علاقے بھی تڑوا سکتے ہیں۔

بنگلہ دیش وجود میں آیا تو وہاں کے باشندوں نے بھارتی عنایات کا تجربہ ہونے کے بعد بھارت کے برہمنی مہاجنی سامراج کی گود میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ پاکستان کے ساتھ از سرِ نو رشتۂ اخوت قائم ہوا۔ اس کی سزا بھارت نے فرخا بند کا پانی روک کر اور نو برآمد شدہ جزیروں پر ناجائز قبضہ

کر بکھیر دی۔

ادھر آسام کے علاقوں میں غیر مقامی آبادی کے خلاف جو ہلاکت خیز ہنگامہ اٹھا ہے، اس کا ہدف بننے والوں کی اکثریت بھی مسلمانوں ہی کی ہے۔

خیال رہے کہ جنگ ستمبر کے وقت بھی، اور ۱۹۷۱ء کے زمانے میں بھی یہودی لیڈر اور ماہرین نے بھارت پہنچ کر اپنا تعاون پیش کیا ہے۔ اسرائیلی ریاست سے اسلحہ منتقل کیا گیا ہے اور اب یہ خبر عام ہے کہ بھارت جدید قسم کے ٹینک حاصل کرنے کے بعد اپنے سنچورین ٹینک اسرائیلی ریاست کو دے دے گا۔ یہ وہی بھارت ہے جو عرب ممالک کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بظاہر اسرائیلی ریاست کے خلاف ہے۔

تازہ کرم یہ ہے کہ اب جب روس نے افغانستان پر چڑھائی کی تو پاکستان، عرب مسلمانوں اور پورے عالم اسلام کے نقطۂ نظر کے خلاف، بلکہ خاص طور پر بھارتی مسلم اقلیت کے سبھی واضح جذبات کے برعکس اندرا حکومت نے ایک ایسی روس نواز پالیسی اختیار کی جس پر بعض بھارتی سیاستدان بھی مطمئن نہیں ہیں، جبکہ روس کی جارحانہ کارروائی کے خلاف احتجاج ہو رہا تھا، اسی کے ساتھ بھارت نے دوستی کے رشتے میں تازہ گرہیں لگائیں اور روس نے بھاری مشینی، برقی اور جوہری اسلحہ کے انبار لگا کر بھارت کو بالواسطہ طور پر اپنا اڈا بنا لیا۔ اب روسی محاذ کا ایک سرا افغانستان میں ہے تو دوسرا بھارت میں، بیچ میں پاکستان ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ بھارت کے مسلمانوں کے خلاف ہونے والی کارروائی روس ہی کے اشارے سے ہوئی ہو تاکہ عالم اسلام کی توجہ مسئلہ افغانستان سے ہٹائی جا سکے۔

بھارت نے خود تو یہ کیا کہ اپنے تیار کردہ ہلکے اور بھاری اسلحہ کے علاوہ روس سے اربوں ڈالروں کا جدید ترین ہلاکت خیز سامان سمیٹا اور دوسری طرف امریکہ اور فرانس اور دوسرے ممالک سے بھی، مگر وہی یہ چیخ و پکار کر رہا ہے کہ پاکستان اسلحہ جمع کر رہا ہے جو علاقے کے امن کے لیے خطرہ ہے۔ حال ہی میں اندرا نے اس مضحکہ خیز الزام کو بھی تازہ کیا ہے کہ پاکستان اسلامی بم بنا رہا ہے۔

ابھی چند ہی روز پہلے کا یہ زریں کارنامہ ناقابلِ فراموش ہے کہ پاکستان سے فرار کرنے والے حضرات نے لندن میں تیار کردہ اسکیم کے تحت دہلی میں جلاوطن پاکستانی حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا اور اس کا سارا اہتمام بھارت کی سرپرستی میں ہوا۔ وہ تو قدرت کا کرشمہ ہے کہ شرارت کا یہ میزائل

چھپا نہ سکا۔

اجمالاً یہ ہیں وہ کڑیاں جن سے بھارت کی مسلم دشمنی کی تاریخ بنتی ہے، تازہ فساد ہی کو نہیں، پچھلے سارے مسلم کش بلوؤں کو اس تاریخ کے نقشے میں رکھ کر دیکھیے۔ جنہیں سمجھ میں آ سکتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

حالات کی اس پوری تصویر کو سامنے رکھیں تو چند بیانات اور قراردادیں کافی نہیں ہیں۔ اس مسئلے کو عالمِ اسلام سچے جذبۂ اخوتِ اسلامی کے تحت اوّل درجے کی اہمیت دے اور نیا پیچ اختیار کرے اب کی بار زور ان باتوں پر دینا چاہیے کہ:۔

۱۔ بھارت کی حکومت بین الاقوامی سطح پر واضح طور پر مسلم اقلیت کے تحفظ کی ضمانت دے۔

۲۔ تمام مسلم حکومتوں کی طرف ایک مشترک تحقیقاتی وفد کو بھارتی حکومت مدعو کرے اور اسے براہِ راست حالات کو سمجھنے اور خود مسلمانوں سے ان کی داستانِ غم سننے کا موقع دے۔

۳۔ مسلم ممالک سے صحافیوں کے وفود جائیں اور رپورٹیں تیار کر کے اشاعت میں لائیں۔

۴۔ جہاں جہاں انجمن ہلالِ احمر موجود ہے وہاں سے امدادی وفود بھارت میں روانہ کئے جائیں۔

۵۔ مسلم سربراہوں کا فوری طور پر اجلاس بلا کر اس کے ذریعے مطالبہ کیا جائے۔ بھارتی حکومت حالیہ فسادہیں مسلمانوں کی جانی ہلاکت اور ان کے اموال اور کاروبار کی تباہی کا تاوان ادا کرے۔ یہ تاوان خونریزی کرنے والی آبادیوں سے وصول کیا جائے۔

۶۔ مسلمانوں کے جانی و مالی نقصان کے حساب سے ان کی گرفتاریوں اور ان کے خلاف مقدموں کا تناسب دیکھا جائے۔ اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ مسلمان ہی فسادات کا شکار ہوتے ہیں اور پھر مسلمانوں ہی کی زیادہ تعداد مجرم قرار دے کر گرفتار کی جاتی ہے۔ اس دوہرے ظلم کا انسداد کرایا جائے۔

۷۔ فوج یا پولیس کا کوئی ایسا دستہ موقع فساد پر نہ بھیجا جائے جس میں مسلمان سپاہی اور افسر تناسب آبادی کے مطابق شامل نہ ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت پولیس اور فوج کو شرپسند ہندوؤں کی اکثریت کا ساتھ دینے سے نہیں روک سکتی۔ اس تبدیلی کا کم سے کم یہ نتیجہ تو ضرور ہوگا کہ خود پولیس اور فوج کے اندر تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرنے والے لوگ موجود ہوں گے۔

۸۔ حالیہ فساد زدہ علاقوں میں ایسے تحقیقاتی کمیشن بٹھائے جائیں جو عدالتی سربراہی میں ہوں اور

جن میں ہم، ون کے نمائندے ان کی مرضی سے نامزد شدہ (تناسب آبادی کے مطابق شامل ہوں۔

۹۔ تمام مسلم حکومتوں کو چاہئے دنیا بھر کی مسلم اقلیتوں کا ایک خصوصی سیل محکمۂ خارجہ کے تحت قائم

[illegible]

علاوہ پچھلے فسادات پر تحقیقی کام کر کے رپورٹ مکمل کرے۔ اس سیل کی طرف سے ہر سال مسلم اقلیتوں کے متعلق ایک سالانہ رپورٹ (یا YEAR BOOK) شائع ہوا کرے۔

[illegible]

تو بھارتی مسلمانوں سے حسبِ سابق ایک ایک سال میں پانچ پانچ سو مرتبہ ہولی کھیلی جاتی رہے گی۔

[illegible]

تینتیس سالوں کے اوراق پر خونِ مسلم سے لکھی گئی ہے، اور اس کے ساتھ بھارت کے اس اذیت ناک رویے کو جو وہ اپنے پڑوسی مسلم ملک پاکستان کے خلاف اختیار کئے ہوئے ہے، جب سامنے رکھتا ہوں تو مجھے سب سے بڑھ کر تکلیف پاکستان ہی کے بعض بھارت نواز عناصر کے اطوار سے ہوتی ہے۔

یہ وہ عنصر ہے جو ہزارہا مسلمانوں کی تباہی کے عین دوران میں بھی بھارت سے دوستی کے راگ الاپتا ہے۔ اس کے کئی افراد بھارت میں جا کر ریڈیو اور پریس سے ایسی باتیں کرتے ہیں گویا وہ پاکستانی نہیں ہیں۔ پاکستان میں وہ روس اور بھارت کے حلقہ ہائے اثر اندازی (LOBBIES) سے مسحور رہتے ہیں۔ بھارت سے کوئی سرکاری یا ادبی و صحافی شخصیت داخل ہو جائے تو دعوتیں کرتے ہیں اور بچھے جاتے ہیں۔ ماتھوں پر تلک لگاتے ہیں، بھارت کا ٹیلی وژن دیکھے بغیر ان کا کام نہیں ہوتا اور بھارتی فلموں سے لطف اندوز ہوئے بغیر ان کا ہفتہ مکمل نہیں ہوتا۔ ان لوگوں میں اس دیہاتی جتنی غیرت بھی نہیں جو اپنے بھائی کے قاتل سے ملنے تک کا روادار نہیں ہوتا، اور یہاں یہ حال کہ ہزار در ہزار بھائیوں کے قاتلوں کے گلے میں ہار ڈالے جاتے ہیں۔ پاکستان کو جو بھی کمزوریاں اور مشکلات لاحق ہیں وہ اس عنصر کی وجہ سے ہیں۔

---

(۳)

مسائل اور بھی ہیں۔

جن میں اولین مسئلہ افغانستان کا ہے جہاں کے مسلم شہریوں نے بے سروسامانی کے باوجود ایک سپر پاور

کی جارحیت کے خلاف ایمان و آزادی کی خاطر جہاد اور سرفروشی کی وہ مثال پیش کی ہے جس کا کوئی دوسرا نمونہ موجودہ مہذب دنیا میں سامنے نہیں آیا۔

لیکن مغربی قوتیں تھوڑے سے گرماگرم بیانات دینے اور کچھ سفارتی سرگرمی دکھانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکیں۔ اگر مصیبت خود اُن پر آتی تو خاک و خون کے معرکے گرم ہو جاتے، مگر چونکہ ایک مسلم قوم ذبح ہو رہی ہے، اس لیے وہ کافی سمجھتے ہیں کہ روسی جارحیت کے خلاف پروٹسٹ کر دیا جائے اور افغانستانیوں کو داد دی جائے کہ شاباش۔

حد یہ ہے کہ اولمپک کھیلوں کے بائیکاٹ کی اسکیم بھی فیل ہو گئی، تجارتی مقاطعہ بھی کام نہ کر سکا، بلکہ امریکہ کا یہ فیصلہ کہ روس سے اب ٹیکنالوجیکل سطح پر تعاون نہ کیا جائے گا۔ اس میں بھی امریکیوں نے نقب لگائی ہے اور خالص جنگی مقصد کی ٹیکنالوجی روس کو برآمد کی جا رہی ہے۔

لیکن دوسروں سے گلہ کرنے سے پہلے ہمیں اپنا طرزِ عمل دیکھنا چاہیے۔ شروع شروع میں جو شور اُٹھا تھا، اس کی لَے بھی دھیمی پڑ چکی ہے۔ اس سے زائد اگر کچھ کام ہوا تو یہ کہ بعض مغربی قوموں کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک نے بھی مہاجرینِ افغانستان کی امداد کی ہے۔ لیکن نہ دولت سمیٹنے اور دولت سے لطف اُٹھانے یا تفریحات و تعیشات میں مگن رہنے میں کوئی فرق آیا ہے، نہ کوئی تحریکِ جہاد کہیں دکھائی دیتی ہے، نہ لوگ تفرقہ پردازیوں کو چھوڑ کر صفِ اتحاد بنانے کے لیے کہیں کوشاں ہیں۔ کہیں خدا کے سامنے توبہ و انابت نہیں، کہیں ترکِ جرائم اور خیانت سے پرہیز نہیں۔ گویا ملک بہ ملک بدمستوں کے قافلے ہیں جو سر پہ لٹکے ہوئے حالات سے بے خبر لیستی کی طرف لڑھک رہے ہیں۔

---

(۴)

ہم اہل پاکستان ایران کے اسلامی انقلاب کا ہر قدم پر خیر مقدم کرتے رہے ہیں اور اس کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے والے عناصر کے علی الرغم یہاں سے تائید و حمایت کی آواز اُٹھی ہے۔

لیکن ایران کے اخبار جمہوریہ اسلامی میں بھارتی مسلمانوں پہ ٹوٹنے والی قیامت کے سلسلے میں جس طرح کا زہریلا گمراہ کُن اظہار خیال ایڈیٹر صاحب کے دستخطوں کے ساتھ کیا گیا ہے اور بھارت کی پُشت پناہی کرنے کے ساتھ پاکستان کو مخالفت کا ہدف بنایا گیا ہے اسے پڑھ کر تمام اہل پاکستان

کو صدمہ ہوا ہے۔ اس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ مسلم کش بلوے جن کو "ہندو مسلم فساد" کے عنوان وہی شخص دے سکتا ہے جو حالات سے بالکل نابلد ہو، امریکی سامراجی سازش کا نتیجہ ہیں۔ اب ذرا اس فقرے کو بھارت کی مسلم دشمنی کی اُس تاریخ کے سامنے رکھ کر دیکھیے جس کے اجمالی خدوخال ہم نے بیان کئے ہیں۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے بلکہ لمبے سلسلہ واقعات کی ایک کڑی ہے۔ غور صرف ایک کڑی پر نہیں کیا جانا چاہیے، پورے سلسلہ واقعات کو دیکھیے کہ پچھلے ہزار سالہ دور میں کیا بھارت میں سب کچھ امریکی سازش کے تحت ہوتا رہا ہے؟ اگر نہیں تو اخبار جمہوریہ اسلامیہ کے ایڈیٹر صاحب نے کونسی ریسرچ حالیہ مسلم کش بلووں کے خلاف کی ہے کہ وہ کہاں سے کس طرح شروع ہوئے اور کیا شکل اختیار کر گئے ہیں۔ وہ تو یہ بھی نہ جانتے ہوں گے کہ مسلمانوں پہ کیا گزری ہے۔

پھر سوال یہ ہے کہ اس اداریے میں سارا زور امریکی سامراج پر صرف کیا گیا ہے، حالانکہ روسی سامراج بھی کام کر رہا ہے اور بھارت سے تازہ معاہدہ دوستی کر کے اُسے تباہ کُن اسلحہ کے انبار عطا کر کے وہ اتنی اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ افغانستان کے متعلق بھارت کی پالیسی عالم اسلام اور برصغیر کے مسلمانوں کے نقطہ نظر کے خلاف رُوس نوازی کی ہے۔ اندریں صورت یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ روس کے اشارے سے مسلم کش بلووں کی طوفانی لہر اٹھی جو تاکہ وہاں کے مسلمانوں کو افغانستان کے مجاہد مسلمانوں سے ہمدردی کی سزا بھی مل جائے اور پاکستان اور عالم اسلام کی توجہ بھی بٹ جائے۔ سوال یہ ہے کہ اس رُخ پر ایرانی ایڈیٹر صاحب نے کیوں غور نہیں فرمایا۔ نام کو بھی انہوں نے روسی سامراج کی جارحیتوں اور سازشوں کے بارے میں کوئی اظہار احساس نہیں کیا ہے۔ ان کے موقف کو کسی حد تک گوارا کیا جا سکتا تھا، صاحب کہ وہ دونوں سامراجی قوتوں کے لیے یکساں اندیشے ظاہر کرتے۔ اب تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ کوئی رُوس نواز شخص ایرانی اخبار کا اداریہ لکھ رہا ہے۔

ساتھ ہی اپنے الزامِ سازش کی لپیٹ میں انہوں نے پاکستان کو بھی لیا ہے کہ امریکہ اسے مسلح کر کے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ کیا ایرانی ایڈیٹر کو یہ معلوم نہیں کہ پاکستان نے امریکہ سے نہ کوئی فوجی معاہدہ کیا ہے اور نہ اسلحہ کا کوئی سودا کیا ہے۔ بلکہ اُسے جو پیش کش کی گئی تھی اُسے ٹھکرا چکا ہے۔ پاکستان پر خفیہ طور پہ اسلحہ جمع کرنے کا الزام تو بھارتی پروپیگنڈے کا ایک شاخسانہ ہے۔ اگر یہی ماخذ ہے ایرانی ایڈیٹر صاحب کی معلومات کا تو اُن کے راہوار قلم کی جولانیاں نہ جانے

[illegible]
اس لیے جرم ہوگا کہ روس یا بھارت اگر مسلمانوں کی اس مملکت کے خلاف کبھی جارحیت کا ارادہ کریں تو
[illegible]
[illegible] بات [illegible] کیوں [illegible] ہے [illegible] ان کو غیر مسلح رہنا چاہیے، اسلحہ رکھنا صرف ایران اور بھارت
کا حق ہے۔ سوال یہ بھی ہے کہ کیا ایران ہمیں اسلحہ دینے کو تیار ہے؟
[illegible]
دوم کا ایک ملک ہے جس میں اسرائیل اور روس کا نام کھٹکتے ہیں۔ دوسرے بھارت کی دوستی اور روسی
نوازشات کے خزانوں کی کلید بن سکتی ہے۔
[illegible]
صاحب کو یہ خیال کیوں نہ آیا کہ ان کا اوّلین رشتۂ اخوت مسلمانوں کے ساتھ ہے، ملت کے ساتھ ہے،
یہی رشتہ ہے کہ جس کے تحت برسوں سے ہم شاہ کے ظالمانہ اقتدار کے خلاف اسلامی انقلاب کی جدوجہد
کی تائید کرتے رہے ہیں اور اس میں ہم نے شیعہ سنی تفریق کا کبھی لحاظ نہیں رکھا۔ عجیب بات ہے کہ
اسلامی ملکوں سے تو آپ کا ایک مختصر سا اعتماد رکھتا ہے، ان میں ظلم کے انسداد کے لیے اپنے انقلاب
کو برآمد کرنے کا اعلان کرتا ہے [illegible] آپ کا جھگڑا ہے، خلیجی ممالک سے اندرونی طور پر آپ
نفرت رکھتے ہیں، مصر سے ویسے ہی منافرت ہے۔ اب پاکستان پر بھی کھلے حملوں کا آغاز کر دیا گیا ہے،
پھر کیا بھارت میں ہوتے ہوئے مظالم آپ کو دکھائی نہیں دیتے، اور وہاں اسلامی نظام سے محروم
عوام نہیں پائے جاتے۔ وہاں آپ انسداد ظلم کے لیے اپنے انقلاب کو برآمد کرنے کا نعرہ نہیں لگاتے۔
عجیب بات ہے کہ "یا مسلماں، اللہ اللہ" تو نہ ہو، صرف "یا برہمن رام رام" ہو۔

آپ وہاں کے مظلوم مسلمانوں کو نشانۂ عتاب بنانے سے پہلے ذرا بھارتی اخبارات کو بھی بغور دیکھ
لیتے تو اچھا تھا۔ بھارت کے مشہور صحافی خشونت سنگھ نے اس الزام کی تردید کی ہے کہ فسادات کی ذمہ داری
مسلمانوں پر عاید ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہیں اور فوجی اور سول ملازمتوں اور سماجی زندگی
میں اُن کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے، اس وجہ سے ہر بار فسادات میں نقصان اٹھانے والے وہی ہوتے ہیں۔
یہ ہے بھارت کے ایک غیر مسلم صحافی کی شہادت جو موقع پر موجود ہے۔ ایسی شہادتیں اور بہت

یہ بڑی حیرت ہے کہ اس کے مقابل ایران کا ذمہ دار بیٹھا ہو، ایک مسلم حکومت پاکستانی مسلمانوں پہ الزام رکھتا ہے اور اُن کو کسی سازش کا آلۂ کار سمجھتا ہے۔

بہتر تو یہ ہے کہ آپ دشمنی کی بات کرتے ہیں تو پہلے اپنے ان ایرانی اداروں کو تو ہم آہنگ کر لیجیے۔ پھر آپ دوسروں کو تلقین کیجیے گا۔

پاکستان میں ایرانی ناظم الامور نے یہ صفائی دی ہے کہ ہمارا پریس آزاد ہے اور کسی ایڈیٹر نے اگر کوئی بات لکھ دی ہے تو ضروری نہیں کہ وہ سرکاری پالیسی ہو۔ ہم پوچھتے ہیں کہ "مسلم کشی" اور خواتین کی آبرو ریزی، قرآن جلائے جانے اور عبادت گاہوں میں خنزیر گھسا دینے یا خنزیر کا گوشت ڈلوا دینے کے بے حساب واقعات سبب ہو رہے ہوں، تو ایک مسلم حکومت کو اپنی پالیسی واضح کرنی تو چاہیے۔ پھر آپ کی سرکاری پالیسی کیا ہے؟

ایران میں جہاں حکومت کی پالیسی کے خلاف لکھنے والے بعض اخبار بند کر دیے گئے اور جہاں آج بھی کوئی اخبار بے کھٹکے یہ بات نہیں لکھ سکتا، وہاں آخر یہ ممکن کیسے ہوا کہ ایک مسلم اخبار نہایت زہریلا اداریہ بھارتی مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف لکھے اور نہ ایرانی حکومت اُس سے کوئی باز پرس کرے، نہ اس کی تردید میں بیان جاری کرے، نہ اپنی پالیسی کو واضح کرے۔ اگر بالفرض پریس آزاد بھی ہو تو آخر وہ اسلامی انقلاب کے بعد اس معنی میں تو آزاد نہیں ہو سکتا کہ اسلام اور ملت اور مسلم اقوام میں سے جس کے خلاف جو چاہے بکتا رہے، کوئی تعرض نہیں کیا جانا چاہیے۔ اب تو ایڈیٹر صاحب وزیر خارجہ بھی ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو امن سے رہنا چاہیے۔ کاش کہ آپ کو پچھلی ساری تاریخ اور ہندو اکابر کے بیانات اور اُن کے بنیادی فلسفۂ سیاست کا علم ہوتا۔ اگر ظلم سہتے ہوئے امن سے رہنا کوئی معنی رکھتا ہے تو پھر جا کے کہیے فلسطین والوں کو اور فلپائنی مسلمانوں کو اور اریٹیریا کے جانبازوں اور افغانستان کے مجاہدین کو، کہ امن سے رہو، اور اس فلسفے کے تحت تو خود آپ کے ہاں جب ۱۹۶۳ء میں شاہ کے خلاف دینی حلقوں سے جدوجہد ہو رہی تھی تو اُس وقت دنیا بھر کی طرف سے یہی نصیحت کی جانی چاہیے تھی کہ شاہ کے نظامِ ظلم کے تحت امن سے رہیے۔ بلکہ حالیہ انقلاب میں جب عوام اور طلبہ پولیس اور فوج کی گولیوں سے بھن رہے تھے تب بھی آپ پر زور یہی ڈالا جانا چاہیے تھا کہ صاحب جانے دیجیے، آرام چین سے رہیے۔

آپ کی ۱۹۶۳ء والی جدوجہد کے وقت اسی ماہنامہ ترجمان القرآن نے آپ کی انقلابی جدوجہد کے حق میں اور شاہ کے مظالم کے خلاف ایک اداریہ لکھا تھا...... ہمارا یہ قصور اُن وجوہ میں شامل تھا جن کے تحت جماعت کو خلافِ قانون قرار دیا گیا اور جماعت کے اہلِ قیادت جیلوں میں ڈال دیے گئے۔

کیا ہم آپ کی جدوجہد کے متعلق یہ کہتے تو آپ کو اچھا لگتا کہ یہ تو سامراجی سازش ہے یا کوئی غیر خود ہم لوگوں سے کہتا کہ آپ نے کسی سامراجی سازش کے زیرِ اثر ایران کے علماء کی حمایت کی ہے۔

آخر میں ہم محترم رہنما آیت اللہ خمینی سے فریاد کرتے ہیں کہ ہم پاکستان اور برصغیر کے مسلمان جو ہمیشہ سے آپ کی جدوجہد کی تائید کرتے رہے ہیں، اس کے جواب میں بھارت کے مسلمانوں کی سعیِ بقاء و تحفظ کو آپ کے کچھ غلط الفکر لوگ سبوتاژ نہ کریں جو سو سخوار برہمنی مہاجنی سامراج کے خلاف مدتوں سے جاری ہے۔ نیز پاکستان کے ساتھ جہاں اسلامی نظام کی تحریک کام کر رہی ہے اور جہاں کے عوام ایران کے خیر خواہ ہیں، اخوت کے قائم شدہ رشتوں کو توڑنے کے بجائے انہیں مستحکم کریں۔ آپ کے ہاں روس کے آلۂ کار ایسے موجود ہیں کہ ایران کے تعلقات ہر مسلمان ملک سے خراب کر کے اُسے ایسے حلقۂ دوستی میں ٹانک رہے ہیں جس کی باگ ڈور روس کے ہاتھ میں ہے۔ خدارا اپنے موجودہ مرحلۂ زندگی کو ملحوظ رکھ کر آپ غلط عناصر کی شدت سے سرکوبی کریں اور انقلاب کو کسی ایسے صحیح رُخ پر ڈال کے جائیں کہ مختلف ممالک میں بقاء کی جدوجہد کرنے والے مسلمانوں کی مساعی پر پانی نہ پھر جائے۔

بہتر ہوگا کہ آپ فوری طور پر ایک بیان دے کر بھارتی مسلمانوں اور پاکستان کے متعلق پالیسی کے صحت مندانہ خطوط واضح کر دیں اور اس سلسلے میں ایرانی اکابر کو رہنمائی اور ہدایات دیں۔

ہم خدا کے فضل سے آپ کی مساعی اور ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

انٹرویو نمبر

ترجمان القرآن

انٹرویو نمبر

اکتوبر ۱۹۸۰ء

ایک تاریخی یادگار

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
کا
ایک اہم مفصل انٹرویو

جو ریڈیو پاکستان کی طرف سے
۱۹۷۶ء میں لیا گیا تھا

ترجمان القرآن
کی اشاعتِ خاص میں
پیش کیا جا رہا ہے

○ کتابت و طباعت کے لیے غیر معمولی اہتمام

● انٹرویو نمبر کے لیے خصوصی رنگین ٹائیٹل

○ مستقل خریداروں اور نئے سالانہ خریداروں کو نمبر کے لیے زائد ادائیگی نہیں کرنی ہوگی۔

منیجر رسالہ

ترجمان القرآن

۵ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور فون نمبر: ۴۱۰۳۱۶